فہرست

شذرات	مسلمانوں کا مسئلہ	منظور الحسن	۲
قرآنیات	البقرہ (۲: ۱۹۰-۱۹۴)	جاوید احمد غامدی	۷
معارفِ نبوی	جاگتا خدا	طالب محسن	۱۳
دین و دانش	قانون معاشرت (۷)	جاوید احمد غامدی	۲۱
نقطۂ نظر	شورائی اجتہاد	اختر حسین عزمی	۲۵
حالات و وقائع	امت مسلمہ کے مسائل اور ان کا حل (۲)	ڈاکٹر محمد فاروق خان	۳۵
یسئلون	لفظ خلیفہ کا مفہوم	محمد اسلم نجمی	۴۵
اصلاح و دعوت	مجلس نبوی کے آداب	محمد رفیع مفتی	۴۹
	خدا سے دعا	محمد اسلم نجمی	۵۱
	نبی کریمؐ کا عورتوں سے خطاب		۵۲
	انفاق		۵۴
	خدمت خلق	معاذ احسن غامدی	۵۶
تبصرۂ کتب	''مغرب سے مشرق تک''	محمد بلال	۵۹
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۶۹

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مسلمانوں کا مسئلہ

ہم مسلمان کم وبیش ایک ہزار سال تک عالم کی مسند اقتدار پر فائز رہنے کے بعد معزول ہو چکے ہیں۔ یہ واقعہ رونما ہوئے تین چار صدیاں بیت گئی ہیں۔قوموں کی زندگی میں یہ عرصہ نشاۃ ثانیہ کے لیےتو کافی نہیں ہوتا،مگر اس امر کے لیے بہت کافی ہوتا ہے کہ کوئی قوم زوال کے اسباب متعین کر کے ان کے تدارک کے لیے سرگرم ہو جائے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اسباب زوال کا تعین تو کجا، ابھی تک اپنی معزولی کے بارے میں قدرت کا فیصلہ ہی نہیں جان سکے۔دنیا کی محکوم محض قوم ہونے کے باوجود ہم تسلط واقتدار کی نفسیات میں جی رہے ہیں۔گویا ایوان عالم میں پابند سلاسل کھڑے ہیں اور تسخیر کائنات کا اعلان کر رہے ہیں۔ ایک عظیم داستان سفاہت ہے جو ہم نے گزشتہ دو صدیوں میں رقم کی ہے۔یہ داستان کسی خاص خطے یا نسل سے وابستہ نہیں ہے، بلکہ جہاں جہاں ہماری اجتماعیت موجود ہے،اس کے ابواب بکھرے پڑے ہیں۔افغانستان کی جنگ اسی داستان کا ایک الم انگیز باب ہے۔اسے پڑھ کر اہل دنیا حیران ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں جو اجتماعی اخلاقیات میں تنزل کے آخری مقام پر کھڑے ہیں اور اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ دنیا اخلاق کا درس ان سے سیکھے۔جدید علوم وفنون کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں اور تمنا ہے کہ ان کی ہر بات مستند سمجھی جائے۔معمولی دفاع کی صلاحیت سے محروم ہیں،مگر دنیا پر چڑھ دوڑنے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں۔ اپنے پروردگار سے بے گانہ ہیں اور پھر بھی یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کی نصرت ورحمت انھی کے لیے خاص ہے۔

ہم مسلمانوں کی یہ حالت لائق صد افسوس ہے،مگر ماتم اس بات کا ہے کہ مسلمان قوم کو اس مرض میں مبتلا کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھیں منصب مسیحائی حاصل ہے۔ان کی اس مسیحائی کا نظارہ مسجدوں کے منبروں اور مذہبی جلسوں کے اسٹیجوں پر کیا جا سکتا ہے۔جہاں سے انقلاب، جہاد اور تباہ کر دو، برباد کر دو، جلا کر راکھ بنا دو اور جان سے مار ڈالو کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ سادہ لوح مسلمانوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اسلام کا ہدفِ اصلی دنیا پر غلبہ اور حکمرانی قائم کرنا ہے،اس لیے ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے لیے پوری جدوجہد کرے۔اس سے قطع نظر کہ یہ مقدمہ بجائے خود صحیح بھی ہے یا نہیں،ان علم بردارانِ

انقلاب کا طرزِ عمل اپنے مقاصد ہی کے منافی ہے۔ اس ہدف کی طرف بڑھنے کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ ایک جانب اپنے اخلاق و کردار کو اس قدر بلند کیا جائے کہ اقوامِ عالم کی نظریں ان کی جانب اٹھنی شروع ہو جائیں اور دوسری طرف دورِ جدید کے اسلحہ سے اپنے آپ کو لیس کیا جائے اور اس امر واقعی کا ادراک کر لیا جائے کہ دورِ حاضر کے اسلحہ تیر و تفنگ اور گولا بارود نہیں، بلکہ علم و ہنر اور اقتصادی وسائل ہیں۔

اس تناظر میں اگر ہم اپنے وجود اجتماعی کا جائزہ لیں تو چند در چند مسائل کی ایک فہرست رقم کی جا سکتی ہے، مگر ان کے لیے جامع ترین الفاظ جہالت اور غربت ہیں۔ یہ امراض ہمارے پورے وجود میں ناسور کی طرح سرایت کیے ہوئے ہیں۔ ہمارے اخلاق و کردار، تعلیم و تعلم اور نظم و اجتماع میں اس کے مظاہر بالکل نمایاں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اخلاق و کردار کے حوالے سے ہم ان مظاہر کا مشاہدہ کرنا چاہیں تو معلوم ہو گا کہ ہمارا وجود اجتماعی ان اقدار سے بھی خالی ہو چکا ہے جو انسانوں کے مابین ہمیشہ مسلم رہی ہیں اور جنھیں اسلام نے اپنے شعار کے طور پر پیش کیا ہے۔ احترام انسانیت کی قدر جس پر معاشرت کی اساس قائم ہوتی ہے، ہمارے ہاں اس طرح پامال ہو رہی ہے کہ دوسروں کی عزت نفس اور ضمیر و رائے کا احترام تو ایک طرف، انسانی جان بھی اب ہمارے لیے محترم نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم محض اختلاف رائے کی بنا پر دوسرے انسان کا گلا کاٹنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ عدل و انصاف کی قدر جس کی بدولت کوئی معاشرہ امن و آشتی کا گہوارہ بنتا ہے، ہمارے ہاں بری طرح مجروح ہو رہی ہے۔ ہم انفرادی اور اجتماعی، دونوں سطحوں پر ہر معاملے کو اغراض کے حوالے سے دیکھتے اور مفادات کی ترازو میں تولتے ہیں۔ رواداری اور صبر و برداشت کی اقدار سے انسانوں کے مابین محبتیں پروان چڑھتی اور نفرتیں ختم ہوتی ہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ان کے بجائے تعصب، عناد اور اشتعال ہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ احترامِ قانون کی قدر پر کسی اجتماعیت کی سلامتی کا انحصار ہوتا ہے، مگر ہمارا عام رویہ یہ ہے کہ پابندیِ قانون کو ہم اپنی توہین تصور کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم جہاں موجود ہوتے ہیں، وہاں انارکی اور بدنظمی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح شرف و وقار کے تحفظ کے لیے خودداری کی قدر کا ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی قوم اس سے محروم ہو جائے تو اس کے لیے اقوام عالم میں مقام حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں ہمارا حال یہ ہے کہ ہم دنیا میں ایک بھکاری قوم کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ اس کی تفصیل محض یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی معاشی ضروریات کے لیے دوسروں کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں، بلکہ علمی تحقیقات، فنی ایجادات اور تہذیبی معیارات کے لیے بھی ہم دوسروں کی نظر عنایت کے منتظر رہتے ہیں۔

یہ اخلاقی اقدار کے بارے میں ہماری غربت و جہالت کے مظاہر ہیں۔ تعلیم و تعلم کے میدان میں یہ صورت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ اپنے تمام تر معانی کے ساتھ ہم پر منطبق ہو رہے ہیں۔ ہر اس شعبۂ زندگی میں جہاں تعلیم ہی کلید ترقی و بقا ہے، ہم پر پژمردگی طاری ہے۔ فلسفہ و حکمت، علم و ہنر، شعر و ادب، قانون و سیاست، فکر و فن، غرض ہر میدان میں ہمارا شمار دنیا کی پس ماندہ ترین قوموں میں ہوتا ہے۔ ریاضی، کیمیا، طبیعیات، فلکیات،

سیاسیات اور اقتصادیات کے میدانوں میں ہم ان علوم کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں جن میں بعض اقوام برسوں کا سفر طے کر کے کمال فن کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ دنیوی علوم میں ہماری اس جہالت وغفلت نے ہمارے لیے مادی ترقی کے تمام راستے مسدود کر دیے ہیں، معاملہ اگر یہیں تک رہ جاتا تو پھر بھی غنیمت تھی، مگر ہم نے اس سے آگے بڑھ کر علوم دینیہ کے میدان میں بھی اسی طرز عمل کا اظہار کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم حامل دین متین ہونے کی وجہ سے جو سرمایۂ علم واخلاق اہل دنیا کو منتقل کر سکتے اور اس طرح اقوام عالم میں باوقار مقام حاصل کر سکتے تھے، اسے کھو چکے ہیں۔ قوموں کی زندگی میں تنزل وانحطاط کا یہ مقام بھی آ جاتا ہے کہ وہ ترقی کے خارجی عوامل سے بے نیاز ہو جاتی ہیں، مگر یہ صورت حال اس وقت المیہ بن جاتی ہے جب وہ اپنے اثاث البیت ہی سے غافل ہو جائیں۔ دین کے معاملے میں ہم اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔

اس غربت وجہالت کا ایک اور منظر ہمارے نظم واجتماع میں بھی نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اجتماعی ادارے جن پر قوم کی تعمیر کا انحصار ہوتا ہے، بے علمی، بدنظمی اور بدعنوانی کے امراض میں اس قدر مبتلا ہو گئے ہیں کہ ان کی اصلاح اور ان کی بنا پر ترقی کا تصور ہی محال ہے۔ سیاسی ادارے 'امرھم شوریٰ بینھم' کی اساس سے محروم ہیں۔ چنانچہ حکومت نہ مسلمانوں کی رائے سے قائم ہوتی، نہ ان کی تائید سے قائم رہتی اور نہ اس سے محروم ہو جانے کے بعد لازماً ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں نہ عوام سیاسی اعتبار سے پوری طرح باشعور ہو سکے ہیں اور نہ قیادت کی چھان پھٹک کا عمل مکمل ہو سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ابھی تک اپنے داخلی اور خارجی اہداف عمل متعین ہی نہیں کر سکے۔ معاشی نظام کے حوالے سے دیکھیں تو ہم غربت وافلاس کی چکی میں مسلسل پس رہے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات ہر لحاظ سے واضح ہے کہ یہ غربت ہم پر اللہ کی آزمایش کے طور پر نہیں آئی، بلکہ ہماری اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں کا نتیجہ ہے۔ اس میدان میں سود کے خاتمے کے نعرے تو بہت لگائے جا رہے ہیں، مگر اس بات کا ادراک کر کے کہ سود کس طرح ناسور کی طرح انسان کے وجود اجتماعی میں سرایت کیے ہوئے ہے، نہ ہم عوام میں شعوری تبدیلی لانے کے لیے سرگرم ہیں اور نہ ارباب حل وعقد کے سامنے متبادل نظام معیشت کی تجاویز پیش کر رہے ہیں۔ سماجی حوالے سے دیکھیں تو ایک دوسرے کے غم بانٹنے کا طرزِ عمل بھی ہم چھوڑ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں غربت وافلاس کی انتہا اور حکومتوں کی رفاہی امور کی طرف عدم توجہی نے عام آدمی کے مسائل کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اس پر مستزاد نفسانفسی کی فضا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ قیمتی انسانی جانیں دواؤں کی امید میں سسک سسک کر ضائع ہو جاتی ہیں، مناسب بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے بچیاں اپنے گھروں سے رخصت نہیں ہو پاتیں اور ذہین نوجوانوں کو تعلیم ترک کر کے کارخانوں کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ شرم وحیا، ادب واحترام اور خاندانی وقار جیسی ہماری نمائندہ اقدار غیر مستحکم ہو رہی ہیں۔ رفاہ عامہ کے ادارے اول تو نہ ہونے کے برابر ہیں اور جو ہیں، وہ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ تعلیمی نظام کا جائزہ لیں تو واضح ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں تعلیم کا مقصد اول علم ودانش نہیں، بلکہ روزگار کا حصول ہے۔ تعلیمی ادارے مذہبی اور غیر مذہبی اور

اردو اور انگریزی کی غیر فطری تفریق پر مبنی ہیں۔ ان میں بھی نصابات فرسودہ، اساتذہ غیر تربیت یافتہ اور طلبہ محنت سے جی چرانے والے ہیں۔ خواتین جنھیں نئی نسل کو پروان چڑھانا ہوتا ہے، ان کی تعلیم کو کہیں ناجائز اور کہیں غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ عدالتی نظام ایک ایسے بازار کے مانند ہے جس میں جنس انصاف مایہ دار کے لیے ارزاں اور بے مایہ کے لیے ناپید ہے۔ مذہبی اداروں کا حال یہ ہے کہ اگر ان کے پاس تعلیم پانے کے لیے جائیں تو تقلید کا درس ملتا ہے، تربیت حاصل کرنے کے لیے جائیں تو سمع وطاعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور اگر عبادت کے لیے جائیں تو بعض اوقات فرقہ بندی کے نام پر ہدیۂ جان بھی وصول کر لیا جاتا ہے۔

ان ابتر حالات میں یہ ضروری ہے کہ کچھ اصحاب حکمت ودانش قوم میں ان مسائل کا شعور پیدا کرنے کے لیے کھڑے ہوں اور ان کے تدارک کے لیے جدوجہد کریں۔ اس ضمن میں ہمارے نزدیک حسب ذیل مقاصد کو سامنے رکھ کر لائحۂ عمل تشکیل دینا چاہیے۔

۱۔ اخلاقی اقدار کا فروغ

اول یہ کہ مسلمات اخلاق کو لوگوں کے دل ودماغ میں راسخ کیا جائے اور عمل کو ان کے مطابق ڈھالنے کے لیے انھیں تربیت دی جائے۔ انھیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کی نفسیات میں جینے کے بجائے دعوت کے ذریعے سے لوگوں کی اخلاقی اصلاح کو اپنا مقصد بنائیں۔ دنیا کو آزمایش گاہ جانیں اور اہل دنیا کو حق وصداقت اور دین و اخلاق کی نصیحت کرتے ہوئے ان کا ہدف آخرت میں اپنی معذرت پیش کر کے جہنم کے عذاب سے بچنا ہو۔ احترام انسانیت، حق پرستی، رواداری، عدل اور دیانت جیسی اعلیٰ اخلاقی اقدار کو خود بھی اپنائیں اور دوسروں کو بھی ترغیب دیں۔

۲۔ تعلیم کی ترغیب

دوم یہ ہے کہ افراد قوم کے اندر طلب علم اور تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔ انھیں بتایا جائے کہ تعلیم افراد قوم کو فعال بناتی اور اس طرح قومی تعمیر وترقی کی راہیں کھولتی ہے۔ انھیں سمجھایا جائے کہ تعلیم کا مقصد اول روزگار نہیں، بلکہ علم ودانش کا حصول ہونا چاہیے۔ لوگوں کو دینی اور دنیوی، دونوں طرح کی تعلیم کی طرف متوجہ کیا جائے۔ وہ مادی ترقی کے لیے دنیوی تعلیم پائیں اور اخلاقی ترقی اور اخروی کامیابی کی راہیں دریافت کرنے کے لیے دینی تعلیم حاصل کریں۔

۳۔ اجتماعی امور میں رہنمائی

سوم یہ ہے کہ قومی اور اجتماعی اداروں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا جائے۔ اس ضمن میں پہلے دو جہتوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ ان اداروں میں پائی جانے والی خامیوں کی نشان دہی کی جائے اور دوسرے یہ کہ ان خامیوں کی اصلاح کے لیے تجاویز مرتب کی جائیں۔ پھر عوام کے اندر اصلاح احوال کا شعور پیدا کیا جائے اور ارباب اقتدار کو پوری دردمندی کے ساتھ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مثبت تبدیلیوں کی طرف متوجہ کیا جائے۔مثال کے طور پر نظم سیاسی کے بارے میں 'امرھم شوریٰ بینھم ' کے قرآنی حکم کو اساسی اصول کی حیثیت سے اختیار کرنے اور حکمرانوں کے معیار زندگی کو عام شہری کے برابر لانے پر اصرار کیا جائے۔ معیشت کے شعبے میں قومی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ کا وسیع بندوبست قائم کیا جائے اور اس کے علاوہ کوئی اور ٹیکس ہرگز عائد نہ کیا جائے۔ معاشرت کے باب میں خاندان کی اہمیت اجاگر کی جائے اور ایسا سماج تشکیل دیا جائے جس میں شرف ووقار کا معیار حشمت و اقتدار نہیں، بلکہ علم و دانش اور اخلاق وتقویٰ قرار پائے۔تعلیم کے شعبے میں رائج تفریق ختم کر دی جائے اور نصابات کو قدامت اور تقلید سے پاک کیا جائے۔ مذہبی اداروں میں اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ دینی جماعتوں کا اختلاف نظر دشمنی اور عناد کی صورت نہ اختیار کرنے پائے اور مذہب کے نام پر قتل وغارت اور دہشت گردی کی فضا نہ پیدا کی جائے۔

۴۔ پس ماندگی کے خلاف جدوجہد

چہارم یہ کہ مسلمانوں میں اس بات کا شعور پیدا کیا جائے کہ وہ سائنس اور اقتصادیات کے میدان میں اپنی جدوجہد شروع کر دیں۔ موجودہ زمانے میں ترقی کے اصل میدان یہی ہیں۔ اس شعور کی بیداری کے ساتھ مسلمانوں کو اس حقیقت حال سے باخبر کیا جائے کہ ان میدانوں میں پس ماندگی کی وجہ سے وہ دنیا میں بے یار و مددگار ہیں۔ دنیا پر تسلط و بالا دستی تو بہت دور کی بات ہے، وہ اپنی ریاستوں کے اندر بھی حقیقی اقتدار اعلیٰ سے محروم ہیں۔ وہ مغرب کو مفتوح کرنا چاہتے ہیں، مگر اس حقیقت کے ادراک سے عاری ہیں کہ مغرب کے تہذیب وتمدن، فکر وفلسفہ اور علم وفن نے ان کے مادی وجود کے ساتھ ساتھ ان کے دل ودماغ کو بھی مغلوب کر لیا ہے۔ ان کے اہل دانش یورپ کی زبان بولتے اور اسی کی اقدار کو واجب العمل قرار دیتے ہیں، ان کے حکمران اسی کی قصیدہ خوانی کرتے اور کاسۂ گدائی لے کر اسی کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں، ان کے ہنر منداسی کے فنون کی تفہیم کو اپنی تخلیق کی معراج تصور کرتے ہیں، ان کے عوام الناس اسے جنت ارضی سمجھتے اور اس کے حصول کے لیے اپنا معاشرہ، اپنا وطن اور اپنا خاندان تک چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر وہ مغرب پر غلبے کا نعرہ لگاتے ہیں تو اسے زیادہ سے زیادہ ایک نفسیاتی عارضے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ مصائب میں گھرے لوگوں کی مدد

پنجم یہ کہ اپنے گردوپیش میں موجود لوگوں کی مشکلوں اور ضرورتوں پر نگاہ رکھی جائے اور ممکن حد تک ان کی مدد کی جائے۔ کوئی بیمار ہے تو اس کے لیے دواؤں اور علاج معالجے کا بندوبست کیا جائے۔ کوئی طالب علم ضرورت مند ہے تو اس کے لیے فیس اور کتابوں کا انتظام کیا جائے۔ کسی کو بچی کی رخصتی کے لیے تعاون درکار ہے تو اس کی مدد کی جائے۔ اس ضمن میں ایسا نیٹ ورک وجود میں آنا چاہیے کہ لوگ اپنی مدد آپ کے تحت آپس میں ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔

—— منظور الحسن

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة البقرة

(۳۹)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۔ وَاقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ وَاَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَیْثُ

اور اللہ کی راہ میں[۵۱۷] اُن لوگوں سے لڑو جو (حج کی راہ روکنے کے لیے) تم سے لڑیں اور (اِس میں) کوئی زیادتی نہ کرو[۵۱۸]۔ بے شک، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اِن (لڑنے والوں) کو جہاں پاؤ،

[۵۱۷] مطلب یہ ہے کہ جس قتال کا حکم یہاں دیا جا رہا ہے، وہ نہ خواہش نفس کے لیے ہے، نہ مال و دولت کے لیے، نہ ملک کی تسخیر اور زمین کی حکومت کے لیے، نہ شہرت و ناموری کے لیے اور نہ حمیت و حمایت اور عصبیت یا عداوت کے کسی جذبے کی تسکین کے لیے، بلکہ محض اللہ کے لیے ہے۔ انسان کی خود غرضی اور نفسانیت کا اس جنگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اللہ کی جنگ ہے جو اس کے بندے اس کے حکم پر اور اس کی ہدایت کے مطابق اس کی راہ میں لڑتے ہیں۔ ان کی حیثیت اس جنگ میں محض آلات و جوارح کی ہے۔ اس میں ان کو اپنا کوئی مقصد نہیں، بلکہ خدا کے مقاصد پورے کرنے ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی اس حیثیت سے سر مو انحراف نہیں کر سکتے۔

[۵۱۸] یعنی اللہ کی راہ میں یہ قتال اخلاقی حدود سے بے پروا ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقیات ہر حال میں اور ہر چیز پر

اَخۡرَجُوۡکُمۡ وَالۡفِتۡنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ وَلَا تُقٰتِلُوۡھُمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوۡکُمۡ فِیۡہِ فَاِنۡ قٰتَلُوۡکُمۡ فَاقۡتُلُوۡھُمۡ کَذٰلِکَ جَزَآءُ الۡکٰفِرِیۡنَ۔ فَاِنِ انۡتَھَوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ۔ وَقٰتِلُوۡھُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ

قتل کرو اور وہاں سے نکالو، جہاں سے اُنھوں نے تمھیں نکالا ہے[519] اور (یاد رکھو کہ) فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے[520]۔ اور مسجد حرام کے پاس تم اُن سے خود پہل کر کے جنگ نہ کرو، جب تک وہ تم سے اُس میں جنگ نہ کریں[521]۔ پھر اگر وہ جنگ چھیڑ دیں تو اُنھیں (بغیر کسی تردد کے) قتل کرو۔ اِس طرح کے منکروں کی یہی سزا ہے[522]۔ لیکن اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے[523]۔ اور تم یہ جنگ اُن سے برابر کیے

مقدم ہیں اور جنگ و جدال کے موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے ان سے انحراف کی اجازت کسی شخص کو نہیں دی۔

[۵۱۹] یعنی تمھیں نکالنا ہی کچھ کم جرم نہ تھا، لیکن اللہ نے انھیں مہلت دی، اب اگر یہ حج کی راہ بھی روکتے ہیں تو انھیں ام القریٰ مکہ سے اسی طرح نکال دو، جس طرح انھوں نے تمھیں وہاں سے نکالا ہے۔ پھر جہاں پاؤ، قتل کر دو، اس لیے کہ پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اب یہ کسی رعایت کے مستحق نہیں رہے ہے۔

[۵۲۰] ان آیات میں قتال کا جو حکم دیا گیا ہے، یہ اس کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ہر چند حرم کے پاس اور حرام مہینوں میں قتال ایک بڑی ہی سنگین بات ہے، لیکن فتنہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ فتنہ کا لفظ یہاں کسی کو ظلم و جبر کے ساتھ اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے یا مذہب پر عمل سے روکنے کی کوشش کے لیے آیا ہے۔ یہی چیز ہے جسے انگریزی زبان میں 'Persecution' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن نے اسے جگہ جگہ اس معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ فی الواقع قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا آزمایش کے لیے بنائی ہے اور اس میں انسانوں کو حق دیا ہے کہ وہ اپنے آزادانہ فیصلے سے جو دین اور جو نقطۂ نظر چاہیں، اختیار کریں۔ لہٰذا کوئی شخص یا گروہ اگر دوسروں کو بالجبر ان کا دین چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے تو یہ درحقیقت اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی پوری اسکیم کے خلاف اعلان جنگ ہے۔

[۵۲۱] مطلب یہ ہے کہ کسی حرمت کے پامال کرنے میں پہل تمھاری طرف سے نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ مسجد حرام کے پاس اور حرام مہینوں میں قتال اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس کی ابتدا ان کی طرف سے ہو جائے۔ تم اس معاملے میں اپنی طرف سے ابتدا ہرگز نہیں کر سکتے۔

[۵۲۲] یعنی جو رسول کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود اسے نہ مانیں، بلکہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو ان کے

وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ۔ ﴿۱۹۰۔۱۹۳﴾

جاؤ، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین (اِس سرزمین میں) اللہ ہی کا ہو جائے۔[۵۲۴] تاہم وہ باز آ جائیں تو (جان لو کہ) اقدام[۵۲۵] صرف ظالموں کے خلاف ہی جائز ہے۔[۵۲۶] ۱۹۰۔۱۹۳

گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیں اور حج جیسی عبادت کے لیے بھی وہ اگر واپس آنا چاہیں تو حرام مہینوں میں تلوار اٹھائیں اور ان کی راہ میں مزاحم ہو کر کھڑے ہو جائیں، ان کی سزا ایسی ہی سخت ہونی چاہیے۔

[۵۲۳] باز آ جانے سے مراد محض جنگ سے رک جانا نہیں ہے، بلکہ اپنے اس کفر اور سرکشی سے باز آ جانا ہے جس کی سزا اوپر بیان ہوئی ہے۔ اس کے بغیر، ظاہر ہے کہ وہ اللہ کی رحمت اور اس کی مغفرت کے مستحق نہیں ہو سکتے تھے۔

[۵۲۴] اس کے معنی یہ ہیں کہ جس قتال کا حکم یہاں دیا گیا ہے، اس کی غایت صرف یہ نہیں ہے کہ حج کی راہ میں قریش کی مزاحمت ختم کر دی جائے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی ہے کہ فتنہ باقی نہ رہے اور سرزمین عرب میں دین صرف اللہ ہی کا ہو جائے۔ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو جنگ کا حکم انھی دو مقاصد کے لیے دیا گیا ہے۔ پہلے مقصد کے لیے فتنہ کا جو لفظ اصل میں آیا ہے، اس کے معنی ہم نے اوپر بیان کر دیے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دوسروں کو بالجبر ان کے مذہب سے برگشتہ کرنے یا اس پر عمل کی راہ روکنے کی روایت اب بڑی حد تک دنیا سے ختم ہو گئی ہے، لیکن انسان جب تک انسان ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب اور کس صورت میں پھر زندہ ہو جائے۔ اس لیے قرآن کا یہ حکم قیامت تک باقی ہے۔ اللہ کی زمین پر اس طرح کا کوئی فتنہ جب سر اٹھائے، مسلمانوں کی حکومت اگر اتنی قوت رکھتی ہو کہ وہ اس کا استیصال کر سکے تو اس پر لازم ہے کہ مظلوموں کی مدد کے لیے اٹھے اور اللہ کی اس راہ میں جنگ کا اعلان کر دے۔ مسلمانوں کے لیے قرآن کی یہ ہدایت ابدی ہے، اسے دنیا کا کوئی قانون بھی ختم نہیں کر سکتا۔ رہا دوسرا مقصد تو یہ دو ہی صورتوں میں حاصل ہو سکتا تھا: ایک یہ کہ سرزمین عرب میں دین حق کے سوا تمام ادیان کے ماننے والے قتل کر دیے جائیں۔ دوسرے یہ کہ انھیں ہر لحاظ سے زیردست بنا کر رکھا جائے۔ چنانچہ صلح و جنگ کے بہت سے مراحل سے گزر کر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین پوری طرح مغلوب ہو گئے تو بالآخر یہ دونوں ہی طریقے اختیار کیے گئے۔ مشرکین عرب اگر ایمان نہ لائیں تو انھیں ختم کر دینے کا حکم دیا گیا اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں ہدایت کی گئی کہ ان سے جزیہ لے کر اور انھیں پوری طرح محکوم اور زیردست بنا کر ہی اس سرزمین پر رہنے کی اجازت دی جائے۔ ان میں سے البتہ جو معاندین تھے، انھیں جب ممکن ہوا قتل یا جلاوطن کر دیا گیا۔

اس دوسرے مقصد کے لیے قتال اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے جو اس دنیا میں ہمیشہ انھی لوگوں کے ذریعے سے روبہ عمل ہوتا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ ''شہادت'' کے منصب پر فائز کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حق کی ایسی گواہی بن جاتے ہیں کہ اس کے بعد کسی کے لیے اس سے انحراف کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ انسانی تاریخ میں یہ منصب آخری مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو حاصل ہوا ہے۔ اس قانون کی رو سے اللہ کی حجت جب کسی قوم پر پوری ہو جاتی ہے تو اس کے منکرین پر اسی دنیا میں عذاب آجاتا ہے۔ یہ عذاب آسمان سے بھی آتا ہے اور بعض حالات میں اہل حق کی تلواروں کے ذریعے سے بھی۔ پھر اس کے نتیجے میں منکرین لازماً مغلوب ہو جاتے ہیں اور ان کی سرزمین پر حق کا غلبہ پوری قوت کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہی دوسری صورت پیش آئی۔ چنانچہ انھیں جس طرح فتنہ کے خلاف قتال کا حکم دیا گیا، اسی طرح اس مقصد کے لیے بھی تلوار اٹھانے کی ہدایت ہوئی۔ یہ خدا کا کام تھا جو انسانوں کے ہاتھ سے انجام پایا۔ اسے ایک سنتِ الٰہی کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ انسانی اخلاقیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سورۂ توبہ (۹) کی آیت ۱۴ کے الفاظ 'یعذبھم اللّٰہ بایدیکم' میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔

[۵۲۵] اصل میں لفظ 'عدوان' استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی تو زیادتی اور تعدی کے ہیں، لیکن یہاں یہ ٹھیک اس مفہوم میں آیا ہے جس مفہوم میں ہم ''اقدام'' کا لفظ بولتے ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

''عربی زبان میں کبھی کبھی بعض الفاظ محض مجانست و ہم آہنگی کے لیے استعمال ہو جاتے ہیں۔ ان کا مفہوم موقع و محل سے متعین ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں: 'دناھم کما دانوا' (ہم نے ان کو بدلہ دیا، جیسا کہ انھوں نے ہمارے ساتھ کیا)۔ ظاہر ہے کہ یہاں 'دانوا' محض 'دنا' کی مشابہت کی وجہ سے لایا گیا ہے۔ ورنہ موقع 'فعلوا' یا اس کے ہم معنی کسی لفظ کا ہے۔ یا قرآن میں ہے: 'جزاء سیئة سیئة مثلھا'۔ (برائی کا بدلہ اسی کے مانند بدلہ ہے)۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کسی برائی کا بدلہ کوئی برائی نہیں ہے، لیکن محض سابق لفظ کی ہم آہنگی کی وجہ سے جرم کے ساتھ اس کی سزا کو بھی 'سیئة' سے تعبیر کر دیا۔ اسی طرح آگے والی آیت میں ہے: 'فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه' (جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کی زیادتی کے برابر اس کے خلاف اقدام کرو)۔ اس آیت میں کسی کی زیادتی کے جواب میں جو اقدام کیا جائے، اس کو بھی 'اعتدا' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، حالاں کہ یہ معنی میں محض اقدام کے ہے۔ صرف اپنے ماسبق کے ساتھ ہم آہنگی کی وجہ سے اس شکل میں استعمال ہوا۔ عربی زبان کے اسی معروف اسلوب کے مطابق زیر بحث آیت میں بھی لفظ 'عدوان' استعمال ہوا، لیکن مراد اس سے مجرد وہ اقدام ہے جو جوابی کارروائی کے طور پر کیا جائے۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۷۹)

عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ ۔ ﴿۱۹۴﴾

اُنھیں اِس زیادتی کے برابر ہی جواب دو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو اُس کے حدود کی پابندی کرتے ہیں۔[۵۲۸] ۱۹۴

[۵۲۶] یعنی اگر یہ اپنی معاندت چھوڑ کر ایمان و اسلام کی راہ اختیار کر لیں تو ان کے پچھلے جرائم کی بنا پر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے بعد اقدام صرف انھی لوگوں کے خلاف جائز ہو گا جو انکار پر قائم رہیں اور اپنے رویے کی اصلاح نہ کریں۔

[۵۲۷] یعنی ماہ حرام کی حرمت اگر یہ ملحوظ نہیں رکھتے تو اس کے بدلے میں تمھیں بھی حق ہے کہ اس کی پروا کیے بغیر ان کے خلاف جنگ کرو، اس لیے کہ اس طرح کی حرمتیں باہمی طور پر ہی قائم رہ سکتی ہیں، انھیں کوئی ایک فریق اپنے طور پر قائم نہیں رکھ سکتا۔

[۵۲۸] یہ اوپر بیان کیے گئے احکام کی دلیل ارشاد ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ اشہر حرم میں یا حدودِ حرم میں لڑائی بھڑائی ہے تو بہت بڑا گناہ، لیکن جب کفار تمھارے لیے اس کی حرمت کا لحاظ نہیں کرتے تو تمھیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ قصاص کے طور پر تم بھی ان کو ان کی حرمت سے محروم کر دو۔ ہر شخص کی جان شریعت میں محترم ہے، لیکن جب ایک شخص دوسرے کی جان کا احترام نہیں کرتا، اس کو قتل کر دیتا ہے تو اس کے قصاص میں وہ بھی حرمت جان کے حق سے محروم کر کے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اشہر حرم اور حدود حرم کا احترام مسلم ہے، بشرطیکہ کفار بھی ان کا احترام ملحوظ رکھیں اور ان میں دوسروں کو ظلم و ستم کا ہدف نہ بنائیں۔ لیکن جب ان کی تلواریں ان مہینوں میں اور اس بلد امین میں بے نیام ہوتی ہیں تو وہ سزاوار ہیں کہ ان کے قصاص میں وہ بھی ان کے امن و احترام کے حقوق سے محروم کیے جائیں۔ مزید فرمایا کہ جس طرح اشہر حرم کا یہ قصاص ضروری ہے، اسی طرح دوسری حرمتوں کا قصاص بھی ہے۔ یعنی جس محترم چیز کے حقوق حرمت سے وہ تمھیں محروم کریں، تم بھی اس کے قصاص میں اس کے حق حرمت سے انھیں محروم کرنے کا حق رکھتے ہو۔ پس جس جس طرح کے اقدامات حرم اور اشہر حرم کی حرمتوں کو برباد کر کے وہ تمھارے خلاف کریں، تم ان کے جواب ترکی بہ ترکی دو۔ البتہ تقویٰ کے حدود کا لحاظ رہے۔ کسی حد کے توڑنے میں تمھاری طرف سے پیش قدمی نہ ہو اور نہ کوئی اقدام حد ضروری سے زائد ہو۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت انھی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ہر طرح کے حالات میں اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۷۹۔۴۸۰)

(باقی)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

جاگتا خدا

(مشکوٰۃ المصابیح حدیث: ۹۱)

عن أبی موسیٰ رضی اللّٰہ عنه قال: قام بین رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم بخمس کلمات فقال إن اللّٰہ لا ینام، و لا ینبغی له أن ینام، یخفض القسط و یرفعه، و یرفع إلیه العمل اللیل قبل النهار وعمل النهار قبل اللیل، حجابه النور، لو کشفه لأحرقت سبحات وجهه ما انتهی إلیه بصره من خلقه۔

''حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے بیچ میں پانچ باتیں (بیان کرنے کے لیے) کھڑے ہوئے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: اللہ عزوجل سوتے نہیں اور نہ ان کے لیے موزوں ہے کہ وہ سوئیں۔ وہ میزان کو جھکاتے اور اٹھاتے ہیں۔ ان کے سامنے دن سے پہلے رات کے اعمال اور رات سے پہلے دن کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ روشنی ان کا پردہ ہے۔ اگر وہ یہ پردہ ہٹا دیں تو ان کے چہرے کی روشنی ہر اس تخلیق کو جلا ڈالے جہاں تک ان کی نگاہ پہنچے۔''

لغوی مباحث

قام بخمس کلمات: ایک صورت تو یہ ہے کہ بخمس کلمات کو حال لیا جائے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ آپ جب تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ کے پیش نظر یہ پانچ نکات تھے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ قام کے

ساتھ ب بطور صلہ ہو۔اس صورت میں اس کے معنی کسی شے کی حفاظت واستحکام کی سعی کے ہیں۔اس روایت میں یہ معنی مراد لینا محض تکلف ہے۔تیسری صورت یہ ہے کہ بخمس کلمات سے پہلے یتکلم کا فعل محذوف ہو۔یہ صورت متکلم کے منشا کے زیادہ قریب ہے۔

یخفض القسط و یرفعه:قسط کے معنی عدل کے ہیں۔میزان یعنی ترازو کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس سے عدل قائم ہوتا ہے۔شارحین نے خفض و رفع سے ناپ تول کا کام لینا مراد لیا ہے۔ایک رائے یہ ہے کہ قسط سے مراد نصیب ہے اور یہاں رزق کی کمی بیشی کا عمل مراد ہے۔اگرچہ قسط کے نصیب کے معنی میں آنے کی گنجایش لفظ میں موجود ہے، مگر یہاں خفض و رفع کے الفاظ اسے ترازو کے معنی میں لینے کا تقاضا کرتے ہیں۔

سبحات وجهه :سبحات ، سبحة کی جمع ہے۔ سبحة سے مراد روشنی،جلال اور چمک دمک ہے۔وجه کے معنی چہرے کے ہیں، بسا اوقات یہ پورے وجود کو تعبیر کرنے کے لیے آتا ہے۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی نسبت سے یہ لفظ دو پہلوؤں سے استعمال ہوا ہے۔ایک ذات الٰہی کی تعبیر کے لیے جیسے:ویبقی وجه ربك ذو الجلال والاکرام ،(اور تیرے پروردگار صاحب جلال واکرام کا چہرا باقی رہے گا۔[1]) اور دوسرے اللہ کی خوشنودی کی تعبیر کے لیے مثلاً: ما تنفقون الا ابتغاء وجه الله (اور تم صرف اللہ کے چہرے(یعنی اس کی خوش نودی) کے لیے خرچ کرتے ہو۔[2]) سبحات وجهه کی ترکیب میں یہ پہلے معنی ہی میں آیا ہے۔

متون

زیر بحث روایت میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز پانچ باتیں بیان کیں۔مسلم کی ایک روایت میں پانچ کے بجائے چار کا لفظ آیا ہے۔اس روایت میں باتیں بھی چار ہی بیان ہوئی ہیں۔کچھ متون میں سرے سے یہ جملہ ہی نہیں ہے۔ان روایات میں اس روایت کے کچھ اجزا روایت ہوئے ہیں۔کسی روایت میں دو جز اور کسی میں تین جز نقل ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ فرق لفظی ہیں۔مثلاً:ما انتهی الیه بصره کی جگہ کل شیء ادرکه بصره کا جملہ مروی ہے۔مسند احمد اور صحیح ابن حبان کی ایک روایت میں عمل کے پیش کیے جانے کے بجائے یہ بات بیان ہوئی ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إن	''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:اللہ تعالیٰ رات
الله تعالى يبسط يده بالليل ليثوب	کو اپنا ہاتھ پھیلاتے ہیں تاکہ وہ دن کے گناہ گار کو

۱؎ الرحمان۵۵:۲۷۔

۲؎ البقرہ۲:۲۷۲۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مسیء النهار و یبسط یده بالنهار لیتوب مسیء اللیل حتی تطلع الشمس من مغربها۔

معاف کریں، اور دن کو اپنا ہاتھ پھیلاتے ہیں تا کہ رات کے گناہ گار کو معاف کریں یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو جائے۔''

(مسند احمد، رقم ۱۸۷۰۸)

ابن حبان نے یہ مضمون زیر بحث روایت کے جز کے طور پر روایت کیا ہے۔اس روایت کے ایک متن میں حجابه النور کی جگہ حجابه النار کے الفاظ آئے ہیں۔ نار اور نور میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ نار روشنی کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن اس سیاق میں نور کا لفظ ہی موزوں معلوم ہوتا ہے۔قرین قیاس یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نور کا لفظ ہی بولا ہوگا۔

معنی

یہ روایت بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے کچھ نکات کا بیان ہے۔ چنانچہ ہمارے نزدیک اس روایت کا تقدیر کے مسئلے سے براہ راست تعلق نہیں ہے۔صاحب مشکوٰۃ نے اسے تقدیر کے باب میں درج کیا ہے۔اس کا سبب غالباً روایت میں موجود یخفض القسط و یرفعه کا جملہ بنا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مشکوٰۃ نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیب میں کمی بیشی کے مفہوم میں لیا ہے۔اور غالباً اسی وجہ سے وہ اسے باب تقدیر میں لائے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس روایت میں اللہ تعالیٰ کے حوالے سے پانچ باتیں بیان ہوئی ہیں:

۱۔اللہ تعالیٰ نہیں سوتے اور نیندان کے شایان شان نہیں ہے۔

۲۔وہ میزان کے پلڑے جھکاتے اور اٹھاتے ہیں۔

۳۔شب و روز کے اعمال ان کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔

۴۔وہ نور کی اوٹ میں ہیں۔

۵۔اگر وہ یہ اوٹ ہٹا دیں تو ہر چیز جل جائے گی۔

پہلا نکتہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔سورۂ بقرہ کی معروف آیت، آیت الکرسی میں یہ بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: اللّٰہ لا الٰہ الا هو الحی القیوم لا تأخذہ سنة و لا نوم (اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے، سب کا قائم رکھنے والا ہے، نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند[۳]) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نہیں سوتے۔ دوسری یہ کہ نیندان کے شایان شان نہیں ہے۔پہلی بات ایک اطلاع ہے اور براہ راست اس

۳؎ البقرہ ۲: ۲۵۵۔

آیت میں بیان ہوئی ہے۔ دوسری بات اللہ تعالیٰ کی عظمت کو واضح کرتی ہے۔ عظمت کے اس پہلو کو مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر میں بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ محولہ بالا آیت کے تحت لکھتے ہیں:

''حی ٌ کے معنی زندہ کے ہیں۔ اور قیوم کے معنی ہیں وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم اور سب کو قائم رکھنے والی اور سب کو سنبھالنے والی ہو۔ ظاہر ہے جو خود زندہ نہ ہو وہ تمام دنیا جہان کے لیے زندگی بخش کیسے ہوسکتا ہے۔ اور جو خود اپنی ذات پر قائم نہ ہو وہ آسمان و زمین کو قائم رکھنے والا کس طرح ہوسکتا ہے۔...

اس کے بعد فرمایا کہ نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند۔ یہ نیند کی ابتدا اور اس کی انتہا دونوں سے اس کو بری قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ اس کے حی و قیوم ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔ نیند موت کے ظلال و آثار اور اس کے مظاہر و مبادیات میں سے ہے، اس وجہ سے یہ خدا کی شان کے منافی ہے۔ پھر یہ اس کے قیوم ہونے کے بھی منافی ہے، جو خود نیند سے مغلوب ہو کر اپنے آپ کو قائم نہ رکھ سکے گا، وہ دنیا کو کیا قائم رکھے گا۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۸۸)

حقیقت یہ ہے کہ نیند جہاں موت و زوال کا مظہر ہے، وہاں جب طاری ہو جاتی ہے تو عقل و احساس کے تعطل کا نام ہے اور اس طرح ہر اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے حق میں ناموزوں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کمال ایجاز سے یہی بات ایک مختصر جملے میں بیان کر دی ہے۔

دوسرا نکتہ قسط کے خفض و رفع سے متعلق ہے۔ ہم یہ بات لغوی مباحث میں بیان کر چکے ہیں کہ خفض و رفع کے الفاظ متقاضی ہیں کہ قسط سے میزان مراد لی جائے۔ ہماری اس رائے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اس سے اگلی روایت (۹۲) میں یہ جملہ میزان کے لفظ کے ساتھ ہی روایت ہوا ہے۔ غرض یہ کہ اس روایت میں قسط کا لفظ میزان کے مترادف کی حیثیت ہی سے آیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس سے کون سی میزان مراد ہے۔ جن شارحین نے اس سے اعمال کا تولنا مراد لیا ہے، ان کے حق میں اسی روایت کا اگلا جملہ بھی جاتا ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور صبح شام اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کو میزان میں رکھ کر ان کی قدر و قیمت کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ بعض شارحین نے اس پر یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ یہ چیز اس دنیوی زندگی میں خدا کی عنایات کے کم و بیش ہونے کا باعث بھی بنتی ہے۔ اس طرح وہ قسط کے دونوں معنی میں تطبیق بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

لاریب، دنیا میں جاری آزمایش کے قانون کے تحت اللہ تعالیٰ نعمت و نقمت کی مختلف صورتیں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ پھر نعمت و نقمت کی ان صورتوں میں انسان جو رویے اختیار کرتا ہے، اس کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کبھی تنبیہ کے لیے سختی کرتے ہیں، کبھی حوصلہ افزائی کے لیے آسانی مرحمت فرماتے ہیں اور مجرموں کے معاملے میں امہال کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی شارحین کی مذکورہ شرح ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ متکلم کا منشا یہ نہیں ہے۔ ہمیں یہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ان الفاظ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت الکرسی کے لفظ قیـــــوم کے ایک اطلاق کو بیان کیا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ اس دنیا کے نظام کو براہ راست قائم رکھے ہوئے ہیں ۔ یہ نظام ایک توازن پر قائم ہے۔قرآن مجید میں اس توازن کے لیے وضع میزان کی تعبیر خود اللہ تعالیٰ نے اختیار کی ہے۔سورۂ رحمٰن میں ہے:و السماء رفعها و وضع المیزان ،''اور آسمان کو ہم نے اٹھایا اور میزان رکھ دی۔'' معلوم ہوتا ہے روایت میں میزان کا لفظ سورۂ رحمٰن کی اسی آیت سے ماخوذ ہے۔اور میزان ہی کی مناسبت سے اس روایت میں خفض ورفع کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔گویا روایت کا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس توازن کو بحال رکھنے کے لیے اس میزان کے پلڑوں کو جھکاتے اور اٹھاتے رہتے ہیں۔

تیسرا نکتہ اعمال کے پیش کیے جانے سے متعلق ہے۔صبح وشام کے اعمال کے پیش کیے جانے سے مراد فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کے حضور اعمال کے رجسٹر پیش کرنا ہے۔قرآن مجید میں یہ تو بیان ہوا ہے کہ فرشتے اعمال کا ریکارڈ تیار کرتے ہیں۔لیکن یہ بات قرآن مجید میں بیان نہیں ہوئی کہ دن کا ریکارڈ شام کو اور رات کا ریکارڈ صبح کو پیش کر دیا جاتا ہے۔بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ریکارڈ کے ہر وقت مکمل رکھنے کے نظام کا بیان ہے اور اس میں اور قرآن مجید میں کوئی منافات نہیں ہے۔

چوتھی بات اللہ تعالیٰ اور کائنات کے بیچ حائل اوٹ سے متعلق ہے۔اوٹ کے لیے اس روایت میں حجاب کا لفظ آیا ہے اور اس کی ماہیت نور بیان ہوئی ہے۔نور کا لفظ اردو کے لفظ روشنی کا مترادف ہے۔ہمارے لیے یہ متعین کرنا ناممکن ہے کہ اس سے روشنی کی کیا صورت مراد ہے اور یہ بات بھی ہمارے فہم سے بالا ہے کہ یہ اوٹ کیسے بن گئی ہے۔یہ ایک خبر ہے اور اسے ایک خبر ہی کی حیثیت سے مانے بغیر چارہ نہیں۔

قرآن مجید میں یہ بات بھی مذکور نہیں ہے۔البتہ دو مقامات سے اس سے ملتی جلتی بات اخذ کی جا سکتی ہے۔ایک جگہ پر وحی یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیا کے ساتھ رابطے کی صورتیں بیان ہوئی ہیں۔سورۂ شوریٰ میں ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا	''اور کسی بشر کی بھی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام
اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا	کریں،مگر وحی کے ذریعے سے یا پردے کی اوٹ سے
فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۔	یا بھیجے کسی فرشتہ کو، پس وہ وحی کرے اس کے اذن سے
(الشوریٰ ۴۲:۵۱)	جو وہ چاہے۔''

اس آیۂ کریمہ میں ورائے حجاب کا جو ذریعہ بیان ہوا ہے،اس کی مثال حضرت موسیٰ کی پہلی وحی کا واقعہ ہے۔مولانا امین احسن اصلاحی نے اس آیت کے اس ٹکڑے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ پردے کی اوٹ سے بات کرتا ہے۔یعنی نبی اللہ کا کلام اور اس کی آواز تو سنتا ہے،لیکن اس کو دیکھتا نہیں۔اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ کا کلام وخطاب ہے۔تورات اور قرآن دونوں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے بات کی ، مگر اس کو دیکھا نہیں اور قرآن میں یہ تصریح بھی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا اور کسی نبی سے اللہ تعالیٰ نے اس طرح کلام نہیں کیا۔ یہ شرف حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کو حاصل ہوا۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۱۹۲)

ایک دوسرے مقام پر اس واقعے کی تفصیل بیان ہوئی ہے:

اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِاَھْلِہٖٓ اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا سَاٰتِیْکُمْ مِّنْھَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْکُمْ بِشِھَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّکُمْ تَصْطَلُوْنَ ۔ فَلَمَّا جَآءَ ھَا نُوْدِیَ اَنْ بُوْرِکَ مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَھَا وَ سُبْحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ یٰمُوْسٰٓی اِنَّہٗٓ اَنَا اللّٰہُ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ۔ (النمل ۲۷: ۷۔۹)

''یاد کرو جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا، میں نے اک آگ سی دیکھی ہے، میں وہاں سے یا تو کوئی خبر لاتا ہوں یا آگ کا کوئی انگارہ تا کہ تم تاپو، تو جب وہ اس کے پاس آیا تو اس کو آواز آئی کہ مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے اردگرد ہیں اور پاک ہے اللہ عالم کا خداوند ، اے موسیٰ ، یہ تو میں ہوں ، خدائے عزیز و حکیم۔''

سورۂ شوریٰ میں جس چیز کو حجاب کہا گیا ہے سورۂ نمل میں اس کی توضیح آگ سے ہوئی ہے۔ آگ کا لفظ اس روشنی کی تعبیر کے لیے ہے جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگ سمجھا اور اس کی طرف بڑھے تھے۔ ممکن ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مقام سے یہ بات اخذ کی ہو۔

پانچواں نکتہ اس حجاب کے ہٹنے کی صورت میں پیدا ہونے والے نتیجے سے متعلق ہے۔ یہ بات بھی ان الفاظ یا اس مفہوم میں قرآن مجید میں بیان نہیں ہوئی۔ البتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی کا ایک واقعہ اس بات کی حقیقت سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے:

وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَ کَلَّمَہٗ رَبُّہٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ قَالَ لَنْ تَرٰنِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوْفَ تَرٰنِیْ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ، فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَکَ تُبْتُ اِلَیْکَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ (الاعراف ۷: ۱۴۳)

''اور جب موسیٰ ہماری مقررہ مدت پر حاضر ہوا اور اس سے اس کے رب نے کلام کیا تو اس نے درخواست کی کہ اے میرے رب مجھے موقع دے کہ میں تجھے دیکھ لوں ، فرمایا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے ، البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنی جگہ ٹکا رہ سکے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے تو جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر جب ہوش میں آئے تو بولے تو پاک ہے میں نے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تیری طرف رجوع کیا اور میں پہلا ایمان لانے والا بنتا ہوں۔''

یہاں تجلی سے ذات کے پرتو کا ایک شمہ ہی مراد ہے۔ جب ادنیٰ سی جھلک کا یہ معاملہ ہے تو پردہ ہٹانے سے کیا کچھ ہو سکتا ہے۔

کتابیات

مسلم، کتاب الایمان، رقم ۲۶۳، ۲۶۴۔ ابن ماجہ، مقدمہ، رقم ۱۹۱، ۱۹۲۔ احمد، رقم ۱۸۷۰۸، ۱۸۷۰۹، ۱۸۷۶۵، ۱۸۸۰۶۔ صحیح ابن حبان، رقم ۲۶۶۔ مسند ابی عوانہ، رقم ۳۷۹، ۳۸۱۔ مسند ابی یعلی، رقم ۲۶۲۷۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

قانون معاشرت

(۷)

(گزشتہ سے پیوستہ)

مباشرت

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ، قُلْ هُوَ اَذًى، فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ، وَلَاتَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَاتَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۔ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ، وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ، وَبَشِّرِالْمُؤْمِنِيْنَ۔ (البقرہ ۲: ۲۲۲۔۲۲۳)

''اور وہ تم سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دو: یہ نجاست ہے۔ چنانچہ حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ خون سے پاک نہ ہو جائیں، اُن کے قریب نہ جاؤ۔ پھر جب وہ نہا کر پاکیزگی حاصل کر لیں تو اُن سے ملاقات کرو، جہاں سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے۔ بے شک، اللہ توبہ قبول کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ تمھاری یہ عورتیں تمھارے لیے کھیتی ہیں۔ لہٰذا تم اپنی اِس کھیتی میں جس طرح چاہو، آؤ اور (اِس کے ذریعے سے دنیا اور آخرت، دونوں میں) اپنے لیے آگے بڑھاؤ[۱۹]، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ تمھیں (ایک دن) لازماً اُس سے ملنا ہے۔ اور ایمان والوں کو، (اے پیغمبر، اِس ملاقات کے موقع پر فلاح و سعادت کی) خوش خبری سنا دو۔''

مرد و عورت کا جنسی تعلق تو انسان کی جبلت ہے اور وہ اس معاملے میں کسی ہدایت کا محتاج نہیں ہوتا، لیکن حیض و نفاس کے

۱۹؎ یعنی ایسی اولاد پیدا کرو جو دنیا اور آخرت، دونوں میں تمھارے لیے سرمایہ بنے۔ اس ہدایت کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ لوگ بچوں کی پیدایش کے معاملے میں اپنے اقدام کی ذمہ داری سمجھیں اور جو کچھ کریں، اس ذمہ داری کو پوری طرح سمجھ کر کریں۔

جو دن عورتوں پر آتے ہیں، ان میں بھی یہ تعلق کیا قائم رہنا چاہیے؟ بالبداہت واضح ہے کہ دین جس کا مقصد ہی تزکیہ ہے، وہ اسے گوارا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا تمام الہامی مذاہب نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا ہے اور ان ایام میں یہ تعلق ممنوع ٹھیرایا ہے۔ دین ابراہیمی کے زیر اثر عرب جاہلیت بھی اسے ناجائز ہی سمجھتے تھے۔ ان کی شاعری میں اس کا ذکر کئی پہلوؤں سے ہوا ہے۔ اس معاملے میں کوئی اختلاف نہ تھا، لیکن عورت ان ایام سے گزر رہی ہو تو اس سے اجتناب کے حدود کیا ہیں، اس میں، البتہ بہت کچھ افراط و تفریط پائی جاتی تھی۔ چنانچہ لوگوں نے پوچھا تو قرآن نے اس کے متعلق شریعت کا حکم سورۂ بقرہ کی ان آیات میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی ان کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ''اس زمانے میں عورت سے علیحدہ رہنے (اعتزال) کا جو حکم دیا ہے، اس کی صحیح حد آگے کے الفاظ 'و لا تقربوھن حتی یطھرن فاذا تطھرن فاتوھن من حیث امرکم اللّٰہ' (اور تم ان سے قربت نہ کرو، یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں، تو جب وہ پاکیزگی حاصل کر لیں تو ان کے پاس آؤ، جہاں سے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے) سے خود واضح ہو رہی ہے کہ یہ علیحدگی صرف زن و شو کے خاص تعلق کے حد تک ہی مطلوب ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت کو بالکل اچھوت بنا کے رکھ دو، جیسا کہ دوسرے مذاہب میں ہے۔ اس چیز کی وضاحت احادیث اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی ہوئی ہے۔''
> (تدبر قرآن ۱/۵۲۶)

روایات درج ذیل ہیں:

سیدہ عائشہ کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف ہوتے اور وہ حیض کی حالت میں آپ کے سر میں کنگھی کر دیتی تھیں۔[20]

سیدہ ہی کا بیان ہے کہ وہ حیض کی حالت میں ہوتی تھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی گود میں تکیہ کیے ہوئے قرآن پڑھتے تھے۔[21]

انھی سے روایت ہے کہ ہم میں سے کوئی حیض کی حالت میں ہوتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قریب آنا چاہتے تو ہدایت کرتے کہ حیض کی جگہ پر تہ بند باندھ لے، پھر قریب آ جاتے۔[22]

وہ فرماتی ہیں کہ میں حیض کی حالت میں پانی پیتی، پھر وہی پانی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیتی اور آپ اسی جگہ منہ رکھ کر پی لیتے جہاں میں نے رکھا ہوتا۔ اسی طرح ہڈی چوستی، پھر آپ کو دے دیتی اور آپ اسی جگہ منہ رکھ کر کھا لیتے جہاں میں نے رکھا ہوتا۔[23]

۲۰؎ بخاری، رقم ۲۹۶۔

۲۱؎ بخاری، رقم ۲۹۷۔

۲۲؎ بخاری، رقم ۳۰۲۔

۲۳؎ مسلم، رقم ۳۰۰۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

استاذ امام لکھتے ہیں:

''اس آیت میں 'طھر' اور 'تطھر' دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ طہر کے معنی تو یہ ہیں کہ عورت کی ناپاکی کی حالت ختم ہو جائے اور خون کا آنا بند ہو جائے اور تطہر کے معنی یہ ہیں کہ عورت نہا دھو کر پاکیزگی کی حالت میں آ جائے۔ آیت میں عورت سے قربت کے لیے طہر کو شرط قرار دیا ہے اور ساتھ ہی فرما دیا ہے کہ جب وہ پاکیزگی حاصل کر لیں، تب ان کے پاس آؤ۔ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ چونکہ قربت کی ممانعت کی اصلی علت خون ہے، اس وجہ سے اس کے انقطاع کے بعد یہ پابندی تو اٹھ جاتی ہے، لیکن صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب عورت نہا دھو کر پاکیزگی حاصل کر لے، تب اس سے ملاقات کرو۔''

(تدبرِ قرآن ۱/ ۵۲۶)

اس کے ساتھ یہ بات بھی قرآن نے انھی آیات میں واضح کر دی ہے کہ نہا دھو کر پاکیزگی حاصل کر لینے کے بعد بھی عورت سے ملاقات لازماً اسی راستے سے ہونی چاہیے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'فاتوھن من حیث امرکم اللّٰہ' (تو ان سے ملاقات کرو، جہاں سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے)۔ یہ چیز بدیہیات فطرت میں سے ہے اور اس پہلو سے، لاریب خدا ہی کا حکم ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ، درحقیقت خدا کے ایک واضح، بلکہ واضح تر حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے، اور اس پر یقیناً اس کے ہاں سزا کا مستحق ہو گا۔

قرآن نے یہی بات اس کے بعد کھیتی کے استعارے سے واضح فرمائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''عورتوں کے لیے کھیتی کے استعارے میں ایک سیدھا سادہ پہلو تو یہ ہے کہ جس طرح کھیتی کے لیے قدرت کا بنایا ہوا یہ ضابطہ ہے کہ تخم ریزی ٹھیک موسم میں اور مناسب وقت پر کی جاتی ہے، نیز بیج کھیت ہی میں ڈالے جاتے ہیں، کھیت سے باہر نہیں پھینکے جاتے، کوئی کسان اس ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، اسی طرح عورت کے لیے فطرت کا یہ ضابطہ ہے کہ ایام ماہواری کے زمانے میں یا کسی غیر محل میں اس سے قضائے شہوت نہ کی جائے، اس لیے کہ حیض کا زمانہ عورت کے جمام اور غیر آمادگی کا زمانہ ہوتا ہے، اور غیر محل میں مباشرت باعث اذیت و اضاعت ہے۔ اس وجہ سے کسی سلیم الفطرت انسان کے لیے اس کا ارتکاب جائز نہیں۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۵۲۷)

اس کے بعد 'فاتوا حرثکم انی شئتم' (لہٰذا تم اپنی اس کھیتی میں جس طرح چاہو، آؤ) کی وضاحت میں انھوں نے لکھا ہے:

''(اس) میں یہ بیک وقت دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اس آزادی، بے تکلفی، خود مختاری کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی کے مالک کو اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں حاصل ہوتی ہے، اور دوسری اس پابندی، ذمہ داری اور احتیاط کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی والا اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں ملحوظ رکھتا ہے۔ اس دوسری چیز کی طرف 'حرث' کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اور پہلی چیز کی طرف 'انی شئتم' کے الفاظ۔ وہ آزادی اور یہ پابندی، یہ دونوں چیزیں مل کر اس رویے کو متعین کرتی ہیں جو

ایک شوہر کو بیوی کے معاملے میں اختیار کرنا چاہیے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ازدواجی زندگی کا سارا سکون و سرور فریقین کے اس اطمینان میں ہے کہ ان کی خلوت کی آزادیوں پر فطرت کے چند موٹے موٹے قیود کے سوا کوئی قید، کوئی پابندی اور کوئی نگرانی نہیں ہے۔ آزادی کے اس احساس میں بڑا کیف اور بڑا نشہ ہے۔ انسان جب اپنے عیش و سرور کے اس باغ میں داخل ہوتا ہے تو قدرت چاہتی ہے کہ وہ اپنے اس نشہ سے سرشار ہو، لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس کے سامنے قدرت نے رکھ دی ہے کہ یہ کوئی جنگل نہیں، بلکہ اس کا اپنا باغ ہے اور یہ کوئی ویرانہ نہیں، بلکہ اس کی اپنی کھیتی ہے، اس وجہ سے وہ اس میں آنے کو تو سو بار آئے اور جس شان، جس آن، جس سمت اور جس پہلو سے چاہے آئے، لیکن اس باغ کا باغ ہونا اور کھیتی کا کھیتی ہونا یاد رکھے۔ اس کے کسی آنے میں بھی اس حقیقت سے غفلت نہ ہو۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۵۲۷)

یہ ہدایات کس درجہ اہمیت رکھتی ہیں؟ قرآن نے اسے ان آیتوں میں 'ان اللّٰہ یحب التوابین و یحب المتطھرین' (بے شک، اللہ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ آیت کے اس حصے کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس طرح کی ہے:

''توبہ اور تطہر کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ توبہ اپنے باطن کو گناہوں سے پاک کرنے کا نام ہے اور تطہر اپنے ظاہر کو نجاستوں اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے۔ اس اعتبار سے ان دونوں کی حقیقت ایک ہوئی اور مومن کی یہ دونوں خصلتیں اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ ان سے محروم ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں۔ یہاں جس سیاق میں یہ بات آئی ہے، اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ جو لوگ عورت کی ناپاکی کے زمانے میں قربت سے اجتناب نہیں کرتے یا قضائے شہوت کے معاملے میں فطرت کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں، وہ اللہ کے نزدیک نہایت مبغوض ہیں۔''

(تدبر قرآن ۱/ ۵۲۶)

(باقی)

www.al-mawridi.org
www.javedahmadghamidi.com

اختر حسین عزمی

شورائی اجتہاد

عالم اسلام میں سب سے زیادہ قبولیت عامہ جس فقہ کو حاصل ہوئی وہ حنفی فقہ ہے۔ اس کی دیگر وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ امام ابوحنیفہ کا شورائی اجتہاد کا طریقہ ہے۔ اس طریقۂ اجتہاد میں مختلف صلاحیتوں کے حامل اذہان ایک مسئلہ کے ہر رخ پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں جس کے نتیجے میں غلطی کا امکان کم سے کم رہ جاتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب مختلف میلانات ورجحانات کی حامل شخصیات کسی معاملہ پر بحث کرتی ہیں تو فیصلہ متوازن اور معتدل نقطۂ نظر پر ہوتا ہے اور متوازن بات کو عملی زندگی میں خود بخود شرف قبولیت حاصل ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امام شافعی کے استاد امام وکیع بن الجراح امام ابوحنیفہ کے فیصلوں کے بارے میں کہا کرتے تھے:

> ''امام ابوحنیفہ (کے اجتہادی کام میں) غلطی کیسے ہو سکتی ہے، جبکہ ان کے ساتھ قیاس واجتہاد میں ابو یوسف، زفر اور محمد جیسے لوگ تھے۔ یحییٰ بن زائدہ، حفص بن غیاث اور علی کے دونوں بیٹوں حبان اور مندل جیسے حفاظ اور ماہر حدیث شریک مجلس ہوتے اور لغت عربی کے ماہر قاسم بن معن یعنی ابن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود اور داؤد بن نصیر طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زہد وتقویٰ رکھنے والے حضرات وہاں موجود ہوتے تھے۔ جس شخص کے رفقاے کار ایسے ہوں، وہ ہرگز غلطی نہیں کر سکتا، کیونکہ اگر وہ غلطی کرتے تو یہ لوگ یقیناً اس کو حق کی طرف واپس لے آتے۔'' (جامع المسانید ۱/ ۳۳)

عہد صحابہ وتابعین میں شورائی اجتہاد

قبل اس کے کہ امام ابوحنیفہ کے شورائی اندازِ اجتہاد پر بات کی جائے، ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس طریقۂ اجتہاد کے بارے میں احادیث وآثار صحابہ میں جو نظائر ملتے ہیں، ان کا مختصر ذکر کر دیا جائے۔

حضرت میمون بن مہران حضرات ابوبکر وعمر کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ جب بھی ان کے ہاں کوئی اختلافی معاملہ پیش آتا جس کے بارے میں قرآن وسنت میں کوئی صراحت نہ ہوتی تو آپ فقہا صحابہ کے مشورے سے اس کا فیصلہ صادر

فرماتے۔[1]

شیخین کا یہ طریقۂ اجتہاد رسول اللہ کے اس ارشاد سے مطابقت رکھتا ہے کہ جب حضرت علی نے سوال کیا کہ اگر کسی مسئلے میں کتاب وسنت میں صریح نص نہ ملے تو پھر ہم کیا کریں آپ نے فرمایا:

''ماہرین شریعت اور عبادت گزار لوگوں سے مشورہ کرو اور انفرادی رائے کو اختیار نہ کرو۔'' (مجمع الزوائد ۱/۱۷۸)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا:

''(غیر منصوص) معاملات کو عبادت گزار مومنین کی شوریٰ کے حوالے کرو اور انفرادی رائے پر کوئی فیصلہ مت کرو۔''

(مجمع الزوائد ۱/۱۷۸)

شیخین کے اس طرز عمل میں قرآن مجید کے ارشادات و شاورھم فی الامر اور وامرھم شوریٰ بینھم کی اتباع بھی ملحوظ تھی۔

حضرت ابوبکر کا معمول ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

''وہ سرداران قوم اور ان کے بہترین لوگوں کو جمع کر کے ان سے مشورہ طلب کرتے۔ بحث سے جب کسی رائے پر متفق ہو جاتے تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔'' (دارمی ۱/۵۸)

''کنز العمال'' میں اس کے ساتھ یہ روایت بھی ہے کہ: وکذالک یفعل عمر[2]۔

صحاح ستہ میں بہت سی روایات موجود ہیں کہ حضرت عمر کے ہاں باقاعدہ اہل شوریٰ کا اجتماع ہوتا اور پوری بحث وتمحیص کے بعد کوئی متفقہ بات طے پاتی تو اسے نافذ کر دیا جاتا، جیسے مال غنیمت کے بارے میں بحث ہوئی۔ حضرت عمر اپنے گورنروں کو بھی اسی طریقۂ کار پر عمل کرنے کی نصیحت کرتے تھے۔ ایک موقع پر حضرت شریح سے فرمایا: قرآن مجید میں جس حکم کی صراحت ہے، اس کے متعلق کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جس حکم کی صراحت نہیں ہے، اس کے لیے حدیث کی طرف رجوع کرنا، اگر اس میں بھی اس کی صراحت نہ ہو تو اس معاملہ میں اجتہاد کرو اور اہل علم افراد سے مشورہ کر لو۔ ایک روایت میں ہے کہ اس پر موجود علما سے مشورہ کرو[3]۔

علامہ الجوینی فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرام عام فیصلوں، فتاویٰ اور واقعات کے بارے میں تحقیق سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ کسی معاملہ میں اگر قرآن میں صراحت نہ ہوتی تو سنت کی طرف رجوع کرتے اور اگر سنت میں بھی اس کا کوئی حل نہ ملتا تو

---

[1] تاریخ التشریع الاسلامی ۱۲۸۔

[2] حاشیہ مسند احمد ۲/۱۶۶۔

[3] ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضلہ ۲/۵۶۔ ابن قیم، اعلام الموقعین ۲/۱۳۲۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

اجتہاد کرتے اور مشورے کرتے۔ وہ اسی طریقے پر کاربند رہے اور ان کے بعد تابعین نے بھی اس طریقہ پر عمل کیا۔[۴]

اسی طریقہ کی پیروی حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ مدینہ کے گورنر ہوئے تو مروان کے گھر میں دس ممتاز فقہا کو مدعو کیا جن میں عروہ بن زبیر، عبداللہ بن عتبہ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، ابوبکر بن سلیمان، سلیمان بن یسار، قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عامر اور خارجہ بن زید شامل تھے۔ ان کے جمع ہونے پر فرمایا: ''میں نے آپ حضرات کو جس کام کے لیے زحمت دی ہے، ان شاءاللہ آپ عنداللہ ماجور ہوں گے، نیز حق کے معاونین میں آپ کا شمار ہوگا۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کی رائے اور مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کروں۔''[۵]

اندلس میں اموی قاضی القضاۃ یحییٰ بن یحییٰ اللیثی نے بھی فقہی مسائل پر غور وخوض کے لیے ایک مجلسِ شوریٰ بنائی ہوئی تھی جس کے ممبران کی تعداد کبھی کبھی سولہ تک ہو جاتی تھی۔[۶]

امام ابوحنیفہ کی مجلس تشریح اسلامی

خلافت علی منہاج النبوۃ کے خاتمے کی وجہ سے حکمرانوں کی طرف سے شرعی مسائل کی تحقیق کے لیے شورائی نظام قائم کر کے مسائل طے کرنے کا اہتمام نہ رہا تو عندالضرورت فقہا و مجتہدین کے ہاں انفرادی اجتہاد کا سلسلہ شروع ہوا اور ہر مجتہد وفقیہ اجتہادی مسائل میں اپنی شخصی رائے سے فیصلہ کرنے لگا۔ اور اس کے معتقدین وتلامذہ اس کے علم وتقویٰ اور اجتہادی اہلیت کی بنا پر اعتماد کر کے اس شرعی حکم کی پیروی کرتے۔ ان حالات میں امام ابوحنیفہ نے غیر سرکاری طور پر اپنے تلامذہ ومسترشدین کے حلقہ میں مسائل شرعیہ کی تحقیق کے لیے باقاعدہ ایک اجتماعی شورائی نظام قائم کیا۔ خلافت عباسیہ کے قیام کے بعد امام ابوحنیفہ حجاز مقدس سے اپنے شہر کوفہ آئے اور یہاں شریعت اسلامی کو باقاعدہ ضابطۂ قانون کے قالب میں ڈھالنے کے لیے وضع قانون کی ایک مجلس شوریٰ قائم کی جس کے رئیس وہ خود تھے۔ آپ کے سوانح نگار موفق لکھتے ہیں:

> ''پھر امام ابوحنیفہ نے اپنے مکتب فکر کو باہمی مشاورت پر استوار کیا۔ ارکان شوریٰ سے الگ رائے کے ساتھ تدوین کو وابستہ نہیں کیا۔'' (موفق ۲/۱۲۳)

اس مجلس میں فقہی مسائل کو زیر بحث لانے اور فیصلہ کرنے کا طریقہ یوں بیان ہوا ہے:

> ''وہ اس مجلس میں ایک مسئلہ پیش کرتے۔ لوگوں کے خیالات ومعلومات کو الٹ پلٹ کر معلوم کرتے، ان کی باتیں سنتے اور جو علم انھیں خود ہوتا، اسے بیان کرتے۔ اہل مجلس سے مناظرہ کرتے جو مہینا مہینا بھر یا اس سے بھی زیادہ مدت جاری رہتا،

---

۴ امام الحرمین الجوینی، غیاث الامم فی التیاث الظلم ۱۳۱۔

۵ اصول التشریع الاسلامی، علی حسب اللہ ۱۴۸۔

۶ علم اصول فقہ، شیخ عبدالوہاب خلاف ۵۰۔

یہاں تک کہ مسئلے کا کوئی ایک پہلو متعین ہو جاتا اور مسئلہ طے ہو جاتا۔'' (موفق ۲/۱۳۳)

حضرت عبداللہ بن مبارک کے حوالے سے موفق نے یہ نقل کیا ہے کہ ایک فقہی مسئلہ اس مجلس میں بحث کے لیے پیش ہوا تو تین دن تک ارکان مجلس اس ایک مسئلے پر غور وخوض کرتے رہے۔ مشہور محدث سلیمان اعمش نے اس مجلس کے طریق کار اور تحقیقی انداز کی بہت خوب صورت تصویر کشی کی ہے، فرمایا: جب اس مجلس کے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو ارکان مجلس اس مسئلے کو گردش دیتے رہتے۔ (یعنی سب اپنی اپنی دلیلیں باری باری دیتے) بالآخر اس کو خوب روشن اور واضح کر دیتے ہیں۔

اس مجلس میں ہر فرد کو اپنی رائے اور اس کی دلیل پوری آزادی کے ساتھ پیش کرنے کی آزادی تھی۔ اس بارے میں ابوسلیمان جوزجانی ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں امام صاحب کی مجلس میں حاضر تھا کہ ایک نوجوان نے حضرت امام سے ایک سوال کیا۔ آپ نے اس کا جواب دیا۔ جواب سنتے ہی اس نوجوان نے بے دھڑک حضرت امام کو مخاطب کر کے کہا: آپ نے غلطی کی۔ اس طرز گفتگو کو دیکھ کر میں حیران ہوا اور اہل مجلس کو کہا کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ تم لوگ اپنے استاد کا احترام نہیں کرتے۔ اس کے جواب میں فوراً ہی خود امام صاحب نے فرمایا: تم ان لوگوں کو چھوڑ و میں نے خود ہی ان کو اس طرح بات کرنے کا عادی بنایا ہے۔ دوسری طرف جوزجانی سے یہ بھی منقول ہے کہ جب مجلس میں امام ابوحنیفہ تقریر شروع کرتے تو سب کے سب چپ ہو جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوئی مجلس میں موجود ہی نہیں۔ حالانکہ اس وقت مجلس میں جید علما حاضر ہوتے اور خود امام محمد نے اس مجلس کا تذکرہ یوں کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی عادت تھی کہ وہ تلامذہ کے ساتھ مناظرہ کرتے۔ تلامذہ کبھی تو امام صاحب کی بات مان لیتے اور کبھی امام صاحب کے دلائل اور رائے کے مقابلے میں اپنی رائے اور دلیلیں پیش کرتے۔

عبداللہ بن نمیر نے اس مجلس کی نقشہ کشی یوں کی ہے:

''امام ابوحنیفہ جب مجلس میں تشریف فرما ہو جاتے تو ان کے اردگرد ان کے رفقا و تلامذہ بیٹھ جاتے۔ جن میں قاسم بن معن، عافیہ بن یزید، داؤد طائی، زفر بن ہذیل اور اسی قسم کے اور لوگ ہوتے۔ اس کے بعد کسی مسئلے کا ذکر چھڑ جاتا، پہلے امام صاحب کے تلامذہ اپنی اپنی معلومات کے لحاظ سے اس مسئلے پر بحث کرتے اور خوب کھل کر گفتگو کرتے، یہاں تک کہ ان کی آوازیں بلند ہو جاتی تھیں۔ جب باتیں بہت بڑھ جاتیں اور سارے پہلو سامنے آ جاتے تب آخر میں امام صاحب اپنی تقریر شروع کرتے۔ امام صاحب کی تقریر جس وقت شروع ہو جاتی تو سارے خاموش ہو جاتے اور جب تک امام صاحب تقریر فرماتے کوئی کچھ نہ بولتا۔'' (موفق ۲/۱۵۰)

حضرت امام ابوحنیفہ کا یہ طریقہ تھا کہ مجلس میں جس وقت بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو بار بار ان کی زبان پر قرآنی

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

آیت و بشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ جاری ہوجاتی یعنی شرکاے مجلس کو اس طرح یہ سمجھایا جاتا کہ ہم اس وقت احسن القول کی تلاش وجستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ آپ اپنے اجتہادی مسائل کے بارے میں اکثر یہ فرمایا کرتے تھے: ھو احسن ما قدرنا علیہ۔ یعنی جہاں تک پہنچنا ہمارے بس میں تھا، اس میں سے بہتر پہلو مسئلے کا یہی ہے۔ غرضیکہ امام ابوحنیفہ کی اس مجلس میں اسی طرح آزادانہ بحث وتمحیص، مناظرہ اور دلائل پیش کرنے کے بعد جو فقہی قوانین طے پائے ایک روایت کے مطابق ان کی تعداد پانچ لاکھ ہے۔ اور خوارزمی کی ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ تراسی ہزار مسئلے اس مجلس میں طے ہوئے تھے۔ ان تراسی ہزار دفعات میں سے صرف اڑتیس ہزار مسائل کا تعلق عبادات سے تھا اور باقی پینتالیس ہزار دفعات کا تعلق معاملات سے ہے۔[7]

اوصاف مجتہد اور عصر حاضر

اجتہاد اپنے اصطلاحی مفہوم کے اعتبار سے کسی معاملہ میں شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے انتہائی کوشش کرنے کا نام ہے۔[8] علما نے مجتہد کے لیے جن شرائط کو لازمی قرار دیا ہے، ان میں پہلی شرط یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کے لغوی وشرعی مفاہیم اور آیات احکام سے واقف ہو، نیز قرآن سے متعلق دوسرے علوم جیسے ناسخ ومنسوخ، عام وخاص، مطلق ومقید اور سبب نزول کی معرفت رکھتا ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اسے سنت نبوی کی پوری معرفت حاصل ہو۔ احکامی احادیث، اصطلاحات حدیث اور فن اسماء الرجال پر عبور حاصل ہو۔ تیسرے اسے ان مسائل کا علم ہو جن پر پہلے سے اجماع ہے۔ چوتھے عربی زبان وادب کی تمام نزاکتیں اور جزئیات اسے مستحضر ہوں۔ پانچویں یہ کہ اصول فقہ کا علم رکھتا ہو۔ دلائل اور ان کے مدلولات کا باہمی رشتہ کیا ہے، اور دلائل میں تعارض کے وقت ترجیح کے اسباب ووجوہ کیا ہوتے ہیں نیز ناسخ ومنسوخ کی شرائط کا علم ہو۔ اسی طرح قیاس، اس کی شرائط، اس کے ارکان اور اقسام سے باخبر ہو اور ان اصول وقواعد کا علم رکھتا ہو جن کی بنا پر مجتہد شرعی احکام کا استنباط کرتا ہے۔[9]

مذکورہ بالا شرائط کے بارے میں بعض علما کا خیال ہے کہ موجودہ دور میں کسی ایک شخص کے اندر ان تمام صفات کی موجودگی محال ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مجتہد مطلق کے اندر ان تمام صفات کا موجود ہونا ضروری ہے جس کی بنا پر وہ مقررہ مسالک کے قواعد سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنے طے کردہ اصولوں کی بنیاد پر اجتہاد کرسکتا ہو، لیکن فی زمانہ ایسی قابلیت مفقود ہے۔[10]

۷؎ سید مفتی سیاح الدین کاکاخیل، اسلامی قانون کی تدوین، سہ ماہی ''فکر ونظر'' اکتوبر ۱۹۸۱، ج ۱۹، شمارہ ۴، ص ۵۴۔

۸؎ المستصفیٰ، امام غزالی ۲/ ۳۵۰۔

۹؎ المستصفیٰ، امام غزالی ۲۔ ۳۵۰۔ ۳۵۲۔ الاعتصام، الشاطبی، ابواسحاق ۲/ ۲۹۷۔ التلویح علی التوضیح، تفتازانی، سعد الدین ۲/ ۱۷۷۔ اصول السرخسی، السرخسی، احمد بن ابی سہیل ۱/ ۳۱۰۔

مجتہد مطلق کا وجود اب نایاب ہے، لیکن دوسرے مجتہدین ہر دور میں پائے جاتے رہے ہیں۔ اس لیے جمہور علما نے اجتہاد کے موضوع پر ایک دوسرے پہلو سے بھی گفتگو کی ہے، وہ یہ کہ اجتہاد شعبہ جاتی اور جزئی بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی کسی ایک فن یا علم کے کسی ایک شعبہ میں درجۂ اجتہاد کو پہنچنا۔ اس لیے کہ جزئی اجتہاد کی شرائط سہل اور آسان ہیں جیسا کہ علامہ آمدی کے نزدیک جزئی اجتہاد کے لیے یہی کافی ہے کہ اجتہاد کرنے والا متعلقہ مسئلے سے واقف ہو، غیر متعلق مسائل سے اس کی ناواقفیت اس کی اس اہلیت پر اثر انداز نہیں ہوگی۔[11]

امام رازی کے مطابق اگر کوئی شخص اجتہاد کے لیے مشروط علوم میں کمال حاصل کر لے تو یہ اس کی اعلیٰ صورت ہے، لیکن اگر وہ کسی ایک فن یا مسئلہ میں اجتہاد کی شرائط پوری کر دے تو اس کے لیے اجتہاد جائز ہوگا۔ اگرچہ اس بات پر بعض علما کا اختلاف ہے۔[12]

عصر حاضر میں شورائی اجتہاد کی ضرورت

مجتہد کے لیے ان کڑی شرائط اور جزئی اجتہاد کی گنجایش کے پیش نظر عصر حاضر کے مسائل سے نمٹنے کے لیے قابل عمل راستہ یہی نظر آتا ہے کہ شورائی اجتہاد کی اسی شکل کو آج بھی اختیار کیا جائے جسے امام ابو حنیفہ نے اپنایا تھا۔ آج شورائی اجتہاد کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے کہ عرصۂ دراز تک اجتہاد کا دروازہ بند رہنے کی وجہ سے پہلے تو کوئی اجتہاد کی جرأت ہی نہیں کرتا اور اگر کوئی کر لیتا ہے تو معاشرے میں اس پر اعتماد اور قبولیت کے لیے دلوں میں وسعت نہیں ہے۔ کسی کو کسی مجتہد کے علم پر اور کسی کو اس کے تقویٰ پر بھروسا نہیں ہے۔ تقویٰ وللّٰہیت بھی عنقا ہے، اس لیے شورائی اجتہاد کی صورت میں لوگ ایک ادارے کے اجتماعی فیصلوں پر نسبتاً زیادہ اعتماد کریں گے۔ یہی ایک راستہ ہے جس کے ذریعے سے اجتہاد کے بارے میں خوف اور جمود کی کیفیت ختم ہو سکتی ہے اور جس میں غلطی کے در آنے کے امکانات بھی کم ہو جائیں گے اور تاریخ فقہ بھی اسی راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

دوسرے جدید علوم کی کثرت نے نئے نئے سیاسی و معاشرتی مسائل اور وسائل کو جنم دیا ہے جن کی وجہ سے فکری رویوں میں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ان رویوں میں جہاں شریعت کے لیے خدشات ہیں، وہاں بہت سے امکانات کے دروازے بھی کھل رہے ہیں۔ جیسا کہ بارھویں صدی کے عالم امام صنعائی فرماتے ہیں: ''حق بات یہ ہے کہ اس زمانے میں اجتہاد گزشتہ زمانے کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے، البتہ اس کے لیے حوصلہ مندی، فکر کی سلامتی، فہم صحیح اور کتاب وسنت کے اندر

۱۰؎ الرد علی من اخلا الی الارض، السیوطی ۱۱۳۔

۱۱؎ الاحکام فی اصول الاحکام، الآمدی ۲/ ۲۲۱۔

۱۲؎ المحصول تحقیق طہٰ جابر علوانی، رازی ۲/ ۳۶۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مہارت جیسی صفات کی ضرورت ہے۔''[13]

زمانۂ حال میں اجتہاد کی شرائط کو پورا کرنا اس اعتبار سے آسان ہو گیا ہے کہ طباعت کتب اور اشاعت مخطوطات میں آسانی کی وجہ سے ذرائع علم کی فراوانی ہے۔ مجموعہ ہاے احادیث موجود ہیں جن میں متنوع انداز واسالیب پر حدیثیں جمع کر دی گئی ہیں جن سے صحیح اور غیر صحیح کی تلاش بھی آسان ہو گئی ہے۔ اسی طرح احادیث کے اشاریے اور الفاظ اور موضوعاتی اشاریے موجود ہیں۔ ان سب اسباب ووسائل کی موجودگی کی بنا پر پیش آمدہ مسائل میں راہ عمل کا تعین کرنا آسان ہو گیا ہے۔[14]

فکری واجتماعی رویوں میں ایک مثبت تبدیلی یہ ہے کہ آج بحث و گفتگو اور مکالمے کے ذریعے سے آزادانہ طور پر رائے قائم کرنے کو پسندیدہ طریقہ گردانا جاتا ہے۔ فتوے کے انداز میں علمیت کا حاکمانہ اظہار ناپسندیدہ ہوتا جا رہا ہے، اس اعتبار سے بھی امام ابوحنیفہ مجلس قانون ساز کا انداز جدید ذہن کو اپیل کرتا ہے۔

دور جدید میں حالات ومسائل اور مصالح عامہ کے تغیر اور کثرت علوم کی وجہ سے اجتہاد کی ضرورت جس قدر بڑھ چکی ہے۔ کوئی ایک یا چند منفرد مجتہدین الگ الگ اس کو پورا نہیں کر سکتے، اس لیے کہ منفرد مجتہد کو اصل مسئلہ کی تمام تفصیلات سے آگہی ایک مشکل امر ہے۔ کسی اجل عظیم کے انتظار کے ہم مکلّف نہیں ہیں، بلکہ بحالت موجودہ وسائل افراد اور دیگر وسائل کے مہیا کرنے کے ہی ہم مکلّف ہیں۔ اس کا راستہ یہی ہے کہ جدید دور میں ادارہ سازی کا جو معروف ومروج طریقہ ہے، اس کو اختیار کر کے موضوعات کو تقسیم کرتے ہوئے حسب صلاحیت اور حسب دلچسپی افراد کو کام تفویض کیا جائے۔ بہت سے جدید علوم ایسے ہیں جن کا علم شرط اجتہاد تو نہیں ہے، لیکن موجودہ زمانے میں بہت سے شرعی معاملات پر وہ علوم اثر انداز ہوتے ہیں۔ جیسے طب، اگر زیر اجتہاد قضیہ اس علم سے متعلق ہے تو ایسی صورت میں مجتہد کو طبی ماہرین سے استفادہ کی ضرورت پیش آئے گی اور ان کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر حکم شرعی مرتب ہو گا۔ اس اہمیت کے پیش نظر مختلف شعبہ جات کے ماہر ایسے افراد کی ضرورت بھی ہے جو اگرچہ مجتہدانہ صلاحیتوں کے مالک نہ بھی ہوں، مگر تقویٰ اور فقہ کے بنیادی اصولوں سے آگاہ ہوں تاکہ ان کے شعبے کے متعلق مجتہد کی آرا پر وہ بھی تنقیدی وتائیدی بحث کر سکیں۔ ایسا تبھی ممکن ہے جب شورائی اجتہاد کے لیے کوئی ادارہ وجود میں آئے۔ چنانچہ عصر حاضر کے مفکر و مدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی اس پہلو کے پیش نظر اجتماعی اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''اس طرح کے مسائل پر انفرادی طور پر جو رائیں ظاہر کی جا رہی ہیں، خواہ علماے دین کی طرف سے یا غیر علماے دین کی طرف سے، ان سے ایک ذہنی انتشار پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس طرح کے مسائل پر صحیح رائے قائم کرنے کے لیے مذہب کے گہرے مطالعے کی بھی ضرورت ہے اور ان سوالات کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے جو فی الواقع سائنس کی

---

[13] ارشاد النقاد الی تیسر الجہاد، الصنعانی ۱/۱۱-۱۲۔

[14] معالم الشریعۃ الاسلامیہ، صبحی صالح ۳۴۔

ترقیوں نے پیدا کر دیے ہیں۔ اس وجہ سے علما اور غیر علما، دونوں ہی گروہوں کے لیے ہمارا ناچیز مشورہ یہ ہے کہ اس طرح کے مسائل پر اپنے اپنے طور پر اظہار رائے کے بجائے اجتماعی طور پر غور کرنے اور رائے قائم کرنے کی کوئی شکل اختیار کریں تاکہ وہ معاشرے کو صحیح رہنمائی دے سکیں۔'' (اسلامی قانون کی تدوین، ۱۱۱۔۱۱۲)

مجمع البحوث الاسلامیہ کی پہلی کانفرنس منعقدہ ۱۳۸۳ھ قاہرہ میں منظور کردہ قرارداد میں بھی پیش آمدہ مسائل کے شرعی حل کے کے لیے اجتماعی اجتہاد کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا اور کہا گیا:

''اگر فقہی مذاہب کے احکام ایسے ہوں جن سے مقصد پورا نہ ہوتا ہو تو مسلکی اجتماعی اجتہاد ہوگا اور اس سے بھی اگر یہ مقصد پورا نہ ہو تو مطلق اجتماعی اجتہاد کیا جائے گا۔ اور حتی المقدور یہ مجمع ان وسائل کی فراہمی کا انتظام کرے گا جن سے اس طرح کے اجتماعی اجتہادات کی راہ ہموار ہو سکے۔'' (الموتر الاول لجمع ۱۰۔۱۱)

علامہ شیخ احمد شاکر نے مصر کے ماہرین قانون کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''تقلید محض کی میں پوری طرح مخالفت کرتا ہوں، خواہ متقدمین کی تقلید ہو یا متاخرین کی۔ ایسے ہی انفرادی اجتہاد بھی وضع قانون کے لیے مفید نہیں ہے، بلکہ فرد واحد کے تعلق سے یہ محال ہے۔ جس چیز کی طرف میں دعوت دے رہا ہوں، وہ اجتماعی وشورائی اجتہاد ہے اور یہی چیز مفید ہے، کیونکہ جب مختلف آرا کا باہم تبادلہ ہوگا تو ان شاء اللہ صحیح بات نکل آئے گی۔''

(الشرع واللغۃ ۸۹)

ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ فرماتے ہیں:

''کسی فرد واحد یا متعدد افراد سے جو مختلف موضوعات پر اپنے طور پر کام کر رہے ہوں یہ کام انجام نہیں پا سکتا۔ لہٰذا ایک ایسی اکیڈمی کی ضرورت ہے جو ہر سال پیش آمدہ مسائل پر علما کو دعوت تحقیق دے اور ہر موضوع کا اپنے موضوع کے اعتبار سے اس کی تفصیلات کا مطالعہ کرے۔ پھر اجتماعی طور پر ہر سال مذاکرہ ہو جس میں ہر فرد اپنے نتائج تحقیق پیش کرے۔ پھر اجتماعی قرارداد منظور کی جائے اور اس کی بنیاد پر شرعی حکم کا نفاذ ہو۔ جس پر عمل کرنا مسلمانوں کے لیے ضروری ہو۔ میرے نزدیک اسی عمل کا نام اجماع ہے۔'' (الاسلام والحیاۃ ۱۸۷)

اسی طرح شیخ عبدالوہاب خلاف، شیخ محمود شلتوت، شیخ مصطفیٰ الزرقا اور شیخ محمد طاہر بن عاشورہ نے بھی اجتماعی اجتہاد کی ضرورت کا احساس اجاگر کیا ہے۔

شورائی اجتہاد کی افادیت

صریح اجماع ایک امر محال ہے۔ اس صورت میں صرف اجتماعی اجتہاد ہی فقہ اسلامی کی حیات اور اس کے فروغ وارتقا کا ضامن بن سکتا ہے۔ اور اسی کے ذریعے سے عصری مشکلات ومسائل کا ایسا حل ڈھونڈا جا سکتا ہے جس میں شک وشبہ کا امکان

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بہت کم رہ جائے۔اس لحاظ سے شورائی اجتہاد کی بڑی افادیت ہے۔ چند حسب ذیل ہیں:

۱۔انفرادی اجتہاد کے مقابلے میں شورائی اجتہاد کا فیصلہ حق سے زیادہ قریب ہوتا ہے، کیونکہ ہر بات تفصیلی بحث وتحقیق کے ذریعے سے طے پاتی ہے، جس میں ہر مسئلے کے تمام اطراف وجوانب پر کافی غور ہوتا ہے۔ جبکہ منفرد مجتہد کو اگر ایک رخ معلوم ہوگا تو اس کا دوسرا پہلو اس پر مخفی بھی ہوسکتا ہے۔اس لیے زیادہ امکان ہے کہ وہ کسی ناقص فیصلہ پر پہنچ جائے۔

۲۔انفرادی اجتہاد میں ذاتی مفاد کے حصول اور دوسروں کی خواہشات کی پیروی کا امکان رہتا ہے، جبکہ اجتماعی اجتہاد کی بدولت دین فروشوں اور اہل ہوس کو جھوٹے فتووں کے ذریعے سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا موقع نہیں مل سکتا۔

۳۔شورائی اجتہاد میں چونکہ باہمی مشاورت کے ذریعے سے کسی مسئلے کے شرعی حل تک پہنچا جاتا ہے، اس لیے اس میں ہر مکتب فکر کے دلائل ایک دوسرے کے سامنے آجاتے ہیں، اس وجہ سے علما کے اختلاف کی شدت میں کمی آسکتی ہے اور بہت سی عوامی غلط فہمیوں اور مسلکی تعصّبات کا ازالہ ہوسکتا ہے۔

۴۔اس کے نتیجے میں راہ اعتدال کو اختیار کرنے والے نئے مجتہدین کی بڑی کھیپ تیار ہوسکتی ہے۔

۵۔جدید علوم کے ماہرین پر بھی حکمت دین آشکار ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل وتوضیح سے یہ بات واضح ہوئی کہ اگر ہم پیش آمدہ مسائل ومشکلات سے عہدہ برآ ہونے اور زندگی کی اسلامی نقشہ گری کے لیے اجتہاد کو ناگزیر سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک ایسا حل شرعی طریقے پر معلوم کرنا چاہتے ہیں جس میں تحقیق وتدقیق کی گہرائی بھی ہو اور دلیل وبرہان کی پختگی بھی، جو ہر قسم کے شکوک وشبہات اور طعن سے محفوظ بھی ہو اور جس کو رائے عامہ پورے اعتماد ویقین کے ساتھ قبول بھی کرے، نیز اس کی تنفیذ واجرا میں کوئی دشواری بھی پیش نہ آئے تو پھر اس کے لیے انفرادی اجتہاد کی بجائے شورائی واجتماعی اجتہاد کا طریقہ اپنانا ہوگا۔ یہ فتنہ وانتشار سے بچنے کا محفوظ راستہ بھی ہے اور دورِ جدید کا تقاضا بھی۔ یہ طریقہ سلف سے ہم آہنگ بھی ہے اور وقت کی ضرورت بھی۔

---

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

ڈاکٹر محمد فاروق خان

امت مسلمہ کے مسائل اور ان کا حل

[۲]

وسطی ایشیا کی نو آزاد مسلم ریاستیں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

روس میں کمیونزم کے خاتمے سے وسطی ایشیا میں پانچ آزاد مسلم ریاستوں نے جنم لیا۔ کمیونزم کے خاتمے کے لیے اصل جدوجہد ان ریاستوں میں نہیں، بلکہ یورپی روس اور یورپی رشین فیڈریشن والی ریاستوں میں کی گئی۔ ان پانچ ممالک میں دراصل سابقہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں ہی کو اقتدار منتقل ہوا۔ چنانچہ ان ریاستوں کے اسلام سے محبت کرنے والے عناصر کو اس حقیقت کا تجزیہ کرنا چاہیے تھا کہ یہاں آرمی، انٹیلی جنس، ریاستی طاقت اور باقی تمام ادارے ابھی تک سابقہ قوتوں کے پاس ہیں۔ جب وہ اس حقیقت تک پہنچتے تو یہ بات بھی ان پر کھل جاتی کہ ستر سالہ روسی اقتدار کی وجہ سے عوام دین کی حقیقی تعلیمات سے بہت دور جا چکے ہیں۔ اس لیے پہلی ضرورت اور اصل اہمیت سیاسی جدوجہد کی نہیں، بلکہ معاشرے میں دین کی تعلیمات کو عام کرنے کی ہے۔ حالات اس حد تک تو یقیناً ساز گار ہو چکے تھے کہ دین کی ترویج کے لیے کتابیں لکھی جاتیں، ادارے بنائے جاتے، مساجد کی حالت بہتر بنائی جاتی، لیکن سیاسی جدوجہد کے لیے قطعاً ساز گار نہیں تھے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں پر ہر جگہ عجلت پسندی کا جو غلبہ ہے، اس کے پیش نظر وہاں نہ صرف یہ کہ قبل از وقت سیاسی کام شروع کر دیا گیا، بلکہ جا بجا مسلح گروپ بھی قائم ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دستیاب حالات سے جو فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا، وہ بھی نہ اٹھایا جا سکا۔

اس وقت وہاں کی تمام تنظیموں کے لیے صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ عوام کی اسلامی تعلیمات پر پوری توجہ مرکوز کریں۔ بالکل پر امن رہیں۔ حکومتوں سے بات چیت جاری رکھیں اور جب تک سیاسی فضا انتخابات میں حصہ لینے کے لیے ساز گار نہ ہو۔ تب تک براہ راست مقابلہ نہ کریں۔ اس کے بجائے وہ جمہوری قوتوں کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالیں۔ جب سیاسی کلچر ایک

خاص سطح تک پہنچ جائے گا تب ان کے لیے دوسرے راستے بھی کھل جائیں گے۔

چیچنیا

چیچنیا کے علاقے میں دس لاکھ مسلمان بستے ہیں۔ پچھلی دو جنگوں کے بعد تعداد تقریباً ساڑھے آٹھ لاکھ رہ گئی ہے۔ ان لوگوں میں اسلام کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد یہ علاقہ رشین فیڈریشن کا حصہ رہا۔ اس علاقے کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہ تقریباً چاروں طرف سے روس میں گھرا ہوا ہے۔ اس کی سرحد کا ایک چھوٹا حصہ جارجیا سے بھی ملتا ہے، مگر وہ بھی روس کے زیر اثر اور اس کے ساتھ معاہدات میں بندھا ہوا ملک ہے۔ آزادی کے راستے میں اس سے بڑی رکاوٹ اور کوئی نہیں ہو سکتی، بلکہ دنیا کے نقشے پر ایسا کوئی آزاد ملک کبھی موجود ہی نہیں رہا جو چاروں طرف سے ایک بہت بڑے ملک میں گھرا ہوا ہو۔

چنانچہ چیچنیا کے لیے یہ عملی مطالبہ زیادہ مناسب تھا کہ اسے رشین فیڈریشن کے اندر رہتے ہوئے مکمل اندرونی خود مختاری دی جائے۔ اس مطالبے کا ماننا روس کے لیے ممکن تھا۔ اس طرح اہل چیچنیا اپنے ہاں ایک مکمل مسلمان معاشرہ قائم کر سکتے تھے۔ اس کا ایک اور فائدہ یہ ہوتا کہ روس کے اندر دوسرے خود مختار مسلمان علاقوں کے لیے بھی ایک راستہ کھلتا۔ واضح رہے کہ روس کے اندر کئی ایسے علاقے موجود ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اگر یہ مطالبہ خالصتاً عدم تشدد کے ذریعے سے آئینی و قانونی راستے سے اور مختلف بین الاقوامی فورمز پر مسلسل کیا جاتا تو توقع یہ تھی کہ نہ صرف چیچنیا، بلکہ رفتہ رفتہ دوسرے مسلمان علاقے بھی اندرونی طور پر خود مختار بن جاتے اور روسی احساس برتری اور اشتعال کو ابھارے بغیر پر امن طریقے سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو جاتا۔ اس کے بعد کسی ایسے مناسب مرحلے پر جب گردوپیش کے اور بین الاقوامی حالات سازگار ہوتے تو مکمل آزادی کا مطالبہ بھی کیا جا سکتا تھا۔

تاہم ایسا نہ ہوا۔ اہل چیچنیا نے صرف اپنی آزادی کے بارے میں سوچا اور باقی روسی مسلمانوں کے مفادات کو پس پشت ڈال کر آزادی کا اعلان کر دیا۔ ان کی آزادی کے اعلان پر دینی اعتبار سے کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ پوری قوم جوہر داؤد کی قیادت پر متفق تھی۔ اعلان آزادی بہت پر امن طریقہ سے ہوا۔ اور پورے ملک پر عملاً قبضہ تھا۔ اس وقت روس کی اپنی حالت دگرگوں تھی۔ اس لیے روس کا فوجی ایکشن نیم دلانہ تھا، جس کی وجہ سے وہ ناکام ہوا۔

تاہم چیچنیا کی آزادی میں بنیادی کمزوری تو مضمر تھی۔ روسی اجازت کے بغیر وہ کسی سے رابطہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہاں کوئی امداد نہیں پہنچ سکتی تھی۔ باہر سے کسی کو چیچنیا جانے کے لیے لازماً روس سے اجازت لینا پڑتی۔ گویا یہ ریاست عملاً روسیوں کے رحم و کرم پر تھی اور اس کی وجہ سے روس کے اندر باقی مسلمانوں پر زندگی تنگ ہو گئی۔

جب کوئی قوم جذباتی فیصلے کرنے پر اتر آتی ہے تو اس سے بھیانک غلطیاں سرزد ہونے کا بڑا امکان ہوتا ہے۔ چیچنیا نے

قریبی ریاست داغستان پر حملہ کر دیا اور وہاں کے پانچ دیہاتوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ حملہ دینی تعلیمات اور حکمت کے بالکل خلاف تھا۔ چنانچہ روس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ لوگ ہماری ریاست کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہیں۔ اس وقت روس کی حالت بہت سنبھل چکی تھی۔ اسے اندرونی و بیرونی طور پر کوئی بڑا چیلنج درپیش نہ تھا۔ اس کی افواج کی تعداد چیچنیا کی کل آبادی سے تین گنا زیادہ تھی۔ چنانچہ روس نے حملہ کر کے چیچنیا پر قبضہ کر لیا۔ گروزنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور اس لڑائی میں تقریباً اسی ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ اس لڑائی کا ایک اور قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ اس دفعہ پوری روسی قوم اپنی حکومت کی پشت پر تھی۔ اس لیے کہ سب روسی اہل چیچنیا کو جارح سمجھتے تھے۔

اس پورے معرکے میں اہل چیچنیا نے بے مثال بہادری، عزم اور ہمت کا مظاہرہ کیا۔ روس نے جو مظالم ڈھائے، اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ تاہم اس پورے معرکے میں اسلام اور حکمت کے اعتبار سے بڑی کوتاہی رہی۔ مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور روس کے باقی مسلمانوں پر عرصۂ حیات مزید تنگ ہو گیا۔ اگر اس پورے معاملے میں دین وحکمت سے روشنی حاصل کی جاتی تو یقیناً صورت حال مختلف ہوتی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بلقان ریاستوں کا معاملہ

بوسنیا

۱۹۸۰ء میں مارشل ٹیٹو کی وفات کے بعد یوگوسلاویہ میں زوال کے آثار نمایاں ہوئے۔ رفتہ رفتہ تمام ریاستوں میں اختلافات شروع ہو گئے اور یوگوسلاویہ سے سلووینیا اور کروشیا نامی ریاستوں نے آزادی حاصل کی۔ اس کے پیش نظر بوسنیا کی ریاست نے اپنی پارلیمنٹ میں آزادی کا بل پیش کیا۔ جسے پارلیمنٹ نے بھاری اکثریت سے منظور کر کے عالی جاہ عزت بیگووچ کو اپنا صدر منتخب کر لیا۔ فروری ۱۹۹۲ میں ریفرنڈم ہوا جس میں ننانوے فی صد عوام نے آزادی کے حق میں ووٹ دیا۔ مارچ ۱۹۹۲ میں بوسنیا نے آزادی کا اعلان کیا۔ اپریل میں یورپی برادری اور اقوام متحدہ نے اسے اپنا رکن بنا لیا۔

اس کے بعد بوسنیا کے مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے جانے شروع ہوئے۔ مگر اس پورے عرصے میں پوری قوم اپنے صدر کے جھنڈے تلے متحد رہی۔ کسی بھی ظلم کے ردعمل میں بوسنیا کی قوم یا اس کی فوج نے کوئی ظلم نہیں کیا، حالانکہ وہ چاہتے تو کئی جگہ سربوں کو قتل کر سکتے تھے، مگر انھوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو دفاع تک محدود کیے رکھا۔ ہر موقع پر انھوں نے دنیا کو سربوں کے ظلم وستم اور اپنے صبر سے باخبر کیے رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری دنیا (بشمول غیر مسلم اقوام) کی ہمدردیاں بوسنیا کے ساتھ ہو گئیں۔ اسی وجہ سے امریکی ثالثی کے ذریعے سے بالآخر ڈیٹین امن سمجھوتا طے پایا جس کے نتیجہ میں بوسنیا کے مسلمانوں کو امن نصیب ہوا۔

یہ پوری جدوجہد اسلامی احکام کے عین مطابق تھی۔ دشمن کے ظلم کے مقابلے میں اہل بوسنیا نے مظلومانہ جدوجہد کی۔ پہلے دن ہی سے آئینی وقانونی راستہ اختیار کیا اور اس کا نتیجہ اب دنیا کے سامنے ہے۔

کوسوو

کوسوو میں بھی مسلمان اکثریت میں ہیں اور متحد ہیں۔ وہاں جدوجہد میں انھوں نے اعلیٰ ترین اسلامی اقدار کا خیال رکھا۔ مخالفین کے خلاف ردعمل میں کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی تھی۔ اس کا پھل انھیں اس صورت میں ملا کہ اقوام متحدہ اور مغربی دنیا ان کی طرف دار ہے اور ان کو بچانے کے لیے مغرب نے بلغراد پر ویسی ہی بم باری کی جیسی اس نے کویت کے معاملے میں بغداد پر کی تھی۔ کوسوو کی مسلم ریاست آزادی کی طرف بتدریج بڑھ رہی ہے۔ اگر وہاں کے مسلمان اس طرح متحد رہے اور انھوں نے مسلسل حکمت سے کام لیا تو جلد ہی وہ مکمل آزادی کی منزل پا لیں گے۔

کوسوو کے برعکس مقدونیہ میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ وہاں انھوں نے مسلح جدوجہد شروع کر لی ہے۔ یہ صحیح طرزعمل نہیں ہے۔ اس سے الٹا بوسنیا، کوسوو اور البانیہ کی آزادی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ان کے لیے صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ ایک پارٹی کی شکل میں منظم ومتحد ہو جائیں اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے اقوام متحدہ کی مدد سے سیاسی مذاکرات شروع کر دیں۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تو ڈیٹین امن سمجھوتا کی طرح مقدونیہ کے لیے بھی سمجھوتا ہو جائے گا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مسلمانوں کے معاملات میں اقوام متحدہ کا کردار

تمام مسلمان ممالک رضا کارانہ طور پر اقوام متحدہ کے رکن بنے ہیں۔ اس وقت کوئی ملک اقوام متحدہ کی رکنیت چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مسلمان ممالک دل سے یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ اقوام متحدہ کا وجود ان کے لیے بلحاظ مجموعی فائدہ مند ہے۔ افغانستان جیسا ملک بھی اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے انتہائی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے رکن ملک کو عالمی برادری میں ایک خاص مقام مل جاتا ہے۔ اس کے کچھ حقوق تسلیم کر لیے جاتے ہیں۔ اس کی سرحدیں محفوظ ہو جاتی ہیں اور اس کو اپنے مسائل کے حل کے لیے ایک پلیٹ فارم میسر آ جاتا ہے۔

مسلمانوں کو اقوام متحدہ سے بہت شکایتیں ہیں۔ ان میں کئی شکایتیں جائز ہیں۔ تاہم اکثر شکایتیں مسلمانوں کی اپنی اندرونی کمزوریوں، اقوام متحدہ کے حدود کا صحیح تعین نہ کرنے، عالمی امور میں طاقت ور ممالک کے رویوں کو نہ سمجھنے یا کسی معاملے میں یک طرفہ تصور سامنے رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کی فوجوں نے اپنے سے دس گنا بڑی افواج اور تین ممالک کو بیک وقت شکست دے دی تو اس کی ذمہ داری ان ملکوں کی اپنی کمزوریوں پر عائد ہوتی ہے۔

اس وقت پانچ ملکوں کو اقوام متحدہ میں مستقل ویٹو حاصل ہے۔ اگر آج کوئی مسلمان ملک ٹیکنالوجی اور طاقت میں مفتوح ممالک کے ہم پلہ بن جائے تو شاید اسے سلامتی کونسل کا رکن بننے میں زیادہ عرصہ نہ لگے۔ اقوام متحدہ صرف ان معاملات میں فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے جہاں سلامتی کونسل کے تمام رکن ممالک اور اقوام عالم کا تقریباً پورا اتفاق اسے حاصل ہو۔ جیسا کہ عراق اور یوگوسلاویہ کے معاملے میں ہوا۔ جن معاملات پر سلامتی کونسل میں سنجیدہ اختلاف رائے ہو یا دو بڑے ممالک میں جھگڑا ہو اور ممالک عالم میں عمومی اتفاق رائے نہ ہو، وہاں عقل عام سے یہ واضح ہے کہ اقوام متحدہ گفت وشنید سے زیادہ کوئی کردار ادا نہیں کرسکتی۔ اس سے بڑھ کر اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔

چنانچہ اگر تمام حالات کا غیر جانب دارانہ تجزیہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ کا وجود مسلمانوں کے لیے بلحاظ مجموعی مثبت ہے۔ بیشتر مسلمان ملک اس دور میں آزاد ہوئے۔ ان کے تنازعات میں اقوام متحدہ نے مثبت کردار ادا کیا۔ بوسنیا اور کوسوو کی آزادی اقوام متحدہ ہی کی مرہون منت ہے۔ آج اگر اقوام متحدہ کے اصولوں کے بجائے ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کا اصول پوری طرح کارفرما ہوتا تو مسلمانوں کی حالت اس سے کہیں زیادہ بری ہوتی۔

مسلمان ممالک کی اپنی کمزوریاں

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے آج کے مسائل میں نوے فی صد حصہ خود ان کا اپنا ہے، لیکن بدقسمتی سے ہم تاریخ کے ایسے یک طرفہ مطالعے کے عادی ہو چکے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم اپنی غلطیوں کی طرف اور کمزوریوں کی طرف توجہ کرنے کے بجائے دوسروں کو مطعون کرتے رہتے ہیں۔ اس تحریر کا مقصد تاریخی تجزیہ نہیں ہے، بلکہ محض بطور نمونہ چند اشارات پیش کرنا مقصود ہے۔ اگر افغانستان پہلے دن ہی سے پاکستان کی مخالفت پر کمر بستہ نہ ہوتا (واضح رہے کہ افغانستان وہ واحد ملک تھا جس نے ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ میں پاکستان کی رکنیت کے خلاف ووٹ دیا) اور اس مخالفت میں اپنے ہاں کے اشتراکی عناصر کی مسلسل آب یاری نہ کرتا تو افغانستان کا سانحہ وجود میں نہ آتا۔

اگر عراق، ایران پر حملہ آور نہ ہوتا تو دونوں طرف سے اربوں ڈالر کا نقصان اور دس لاکھ مسلمان قتل نہ ہوتے۔ اور اگر ایران خرم شہر پر دوبارہ قبضہ کے بعد یک طرفہ طور پر لڑائی روک دیتا اور عراق کے اندر نہ گھستا تو دو لاکھ مزید افراد کے قتل سے بچا جاسکتا تھا۔ اسی طرح اگر عراق کویت پر حملہ آور نہ ہوتا تو مزید اربوں ڈالر کے نقصان اور ہزاروں اموات سے بچا جاسکتا تھا۔ اسی لڑائی کی وجہ سے آج امریکی افواج سعودی عرب اور کویت میں موجود ہیں۔

پس جس معاملے کا بھی گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہی غلطیوں سے دوسروں نے فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ ہمیں یہ سوچنا ہے کہ کیا آج سے ہم یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ہم ماضی کی غلطیوں کا اعادہ نہیں کریں گے۔ اور مستقبل میں حکمت ودانش سے کام لیں گے۔

سعودی عرب میں امریکی افواج کی موجودگی

کویت پر عراق کا قبضہ ایک ننگی جارحیت تھی۔ اس سے خلیجی ریاستوں اور سعودی عرب کو جو خطرات لاحق ہوئے، وہ واضح تھے۔ اس وقت مسلمان ممالک میں صرف پاکستان ہی اس قابل تھا کہ اس خطرے سے نمٹنے کے لیے سعودی عرب کی مدد کر سکے اور اگر اس وقت پاکستان کے ساتھ ساتھ ترکی، ایران اور انڈونیشیا پوری طرح سعودی عرب کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تو سعودی عرب اپنی حفاظت کے لیے انھی ممالک پر بھروسا کرتا۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ سعودی عرب نے سب سے پہلے انھی ممالک سے تعاون کے لیے کہا، لیکن بدقسمتی سے اس وقت پورا عالم اسلام اور خصوصاً پاکستان ایک دوسری ہی کیفیت میں تھا۔ اس وقت کے پاکستانی مسلح افواج کے کمانڈر نے برسر عام عراق کی حمایت کی۔ ایسے وقت میں سعودی عرب کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ اپنی حفاظت کے لیے مغرب کو پکارتا، چنانچہ مغرب نے اس کی پکار پر لبیک کہا۔ اپنی افواج سعودی عرب میں اتاریں۔ کویت کو آزاد کرایا۔ عراق بچشم سر دیکھتا رہا کہ اس کے پاس اقوام متحدہ کی فوج کے پاسنگ کے برابر بھی طاقت نہیں۔ اس کے باوجود اس نے آٹھ مہینے کی مسلسل وارننگ سے کوئی سبق نہ سیکھا۔ اس کا فوری اور طویل المیعاد نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

اب یہ بات واضح ہے کہ امریکہ کو اپنی قلیل المیعاد اور طویل المیعاد دونوں قیمتیں وصول کرنی تھیں۔ چنانچہ اس نے یہ دونوں قیمتیں وصول کیں۔ اور اپنی بھرپور حکمت عملی سے ابھی تک وصول کر رہا ہے۔ یہاں یہ اعتراض کرنا بے محل ہے کہ امریکا نے خود عراق کو کویت پر حملہ کی شہ دی تھی یا یہ کہ امریکا نے صدام حسین کو جان بوجھ کر زندہ چھوڑ دیا۔ کیا خدا نے ہمیں یہ عقل نہیں دی کہ ہم اپنے مہلک اقدام کے نتائج وعواقب کا اندازہ لگا سکیں؟ کیا ایران، عراق جنگ سے بھی عراق نے کوئی سبق نہیں سیکھا؟ کیا میلاسووچ کو بلغاریہ کے عوام نے تخت سے اتارا یا اسے امریکا نے مارا؟

اس وقت امریکی افواج سعودی سرزمین پر مقیم ہیں۔ ان کو ایک تدبیر کے تحت دعوت دی گئی تھی۔ اور اب انھیں ایک تدبیر کے تحت ہی واپس بھیجا جا سکتا ہے۔ صدام کا خطرہ اس وقت بھی پوری طرح موجود ہے۔ چنانچہ ایسے حالات میں یہ مطالبہ کرنا کہ امریکی افواج فوری طور پر سعودی ریاست چھوڑ جائیں، غیر حقیقی ہے۔ ان کو یقیناً جانا چاہیے، مگر ایسا صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب سعودی عرب کی افواج خود اپنی سرحدوں کی حفاظت کرنے کے قابل ہو جائیں۔ یا پھر پاکستان جیسا کوئی ملک سعودی عرب کی فوجی ضروریات خود سعودی عرب کی اپنی مصلحتوں کے مطابق پوری کرنے پر آمادہ ہو۔ موجودہ حالات میں ان دونوں باتوں کا حصول ایک طویل المیعاد پالیسی ہی کے طور پر ہی ہو سکتا ہے۔

فلسطین

اسرائیل کے وجود پزیر ہونے میں برطانیہ کے ساتھ ساتھ عثمانی سلطنت کی غلط پالیسیوں اور اس وقت کی خود مختار و نیم

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خودمختار عرب ریاستوں کا بھی حصہ ہے۔ اسی طرح اسرائیل کے قائم رہنے میں جہاں ایک بڑا کردار امریکا کا ہے، وہاں اردگرد کی عرب ریاستیں بھی اس سے بری الذمہ نہیں ہیں۔ تاہم اس مسئلے کا تاریخی تجزیہ اس تحریر کے دائرے سے باہر ہے۔ اس کے بجائے اس تحریر کا اصل مقصد، اس مسئلے کا موجودہ صورت حال کے حوالے سے افقی جائزہ لینا ہے۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں نے ایک دوسرے کو حقیقت کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ اس پر اتفاق ہے کہ ایک آزاد فلسطینی ریاست کا قیام عمل میں آنا چاہیے۔ اس ریاست کی پچانوے فی صد حدود پر بھی اتفاق ہے۔ اصل تنازع یہ ہے کہ 'قبۃ الصخرا' دیوار گریہ اور مسجد اقصیٰ کس کی تحویل میں ہو۔ یہاں ضروری ہے کہ ان اصطلاحات کی وضاحت کی جائے اس لیے کہ فلسطین سے باہر مسلمانوں کی اکثریت ان سے بے خبر ہے۔

بیت المقدس: اس خطے کے مرکزی شہر کا نام یروشلم ہے۔ بیت المقدس کی اصطلاح سے کبھی تو سارا یروشلم شہر مراد لیا جاتا ہے اور کبھی اس سے مسجد اقصیٰ مراد لی جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت اس سے مراد قبۃ الصخرا ہے۔

قبۃ الصخرا: قبۃ الصخرا اس گنبد کا نام ہے جو ایک چٹان پر تعمیر کیا گیا ہے۔ (اسی گنبد کی تصویر ہمیشہ اخبارات و رسائل کی زینت بنتی ہے۔ اور اس کو غلطی سے مسجد اقصیٰ سمجھا جاتا ہے)۔ اس جگہ کے متعلق مختلف تاریخی روایات مشہور ہیں، مگر ان کی کوئی مستند حیثیت نہیں۔ اسی لیے خلفاے راشدین کے دور میں اس چٹان کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ بہت بعد میں اموی حکمران عبدالملک نے اس چٹان پر ایک گنبد تعمیر کیا۔

مسجد اقصیٰ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب یہ سارا علاقہ فتح ہوا تو اس جگہ پر انھوں نے یہ مسجد تعمیر کی۔ مذہبی اور علامتی طور پر یہی مسجد مسلمانوں کے لیے انتہائی مقدس ہے۔

دیوار گریہ: قبۃ الصخرا کی ایک دیوار کو دیوار گریہ (Wailing wall) کہا جاتا ہے۔ یہودیوں کے نزدیک یہ ان کا مقدس ترین مقام ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ ہیکل سلیمانی کی باقیات میں سے ہے۔

درج بالا وضاحت سے یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا مقدس مقام مسجد اقصیٰ ہے۔ یہودیوں کا مقدس مقام دیوار گریہ ہے جبکہ قبۃ الصخرا کی تاریخی اہمیت دونوں کے ہاں موجود ہے۔

ہر منصف المزاج انسان اس سے اتفاق کرے گا کہ ہر مذہب کا مقدس مقام اسی کے پیروکاروں کی تحویل میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس مسئلے کا منصفانہ حل یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ، فلسطینی ریاست کے انتظام میں ہو۔ دیوار گریہ اسرائیل کے پاس ہو اور قبۃ الصخرا دونوں کی مشترکہ کمان کے تحت ہو۔

فلسطینی ریاست کے ضمن میں دوسرا مسئلہ ان فلسطینی مہاجرین کا ہے، جنھیں وقتاً فوقتاً اسرائیلی حکومت نے جلاوطن کر دیا تھا۔ یہ ان کا اخلاقی و قانونی حق ہے کہ انھیں ان کی زمینیں اور مکانات واپس کیے جائیں۔ تاہم موجودہ صورت حال میں یہ حق منوانا عملاً ناممکن ہے۔ مہاجرین کے معاملے میں یہ ایک تاریخی بدقسمتی رہی ہے کہ ان کے لیے دوبارہ اپنے وطن میں آبادکاری

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ناممکن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ نسبتاً عملی حل یہ ہے کہ تمام فلسطینی مہاجرین کے لیے فلسطینی ریاست میں ہی آبادکاری کا انتظام کیا جائے اور اس کے تمام اخراجات امریکا اٹھائے۔

درج بالا خطوط پر کوئی حل صرف پر امن طریقہ سے ہی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ اس لیے دونوں فریقوں کی طرف سے مکالمے پر مبنی غیر متشددانہ رویہ اختیار کرنا ہی دونوں کے مفاد میں ہے۔

عراق

عراقی حکومت خود اپنے ہاتھوں گوناگوں مشکلات میں پھنس چکی ہے۔ پہلے اس نے ایران پر حملہ کیا۔ اس بے نتیجہ جنگ نے دونوں طرف سے دس لاکھ افراد کی زندگیاں لے لیں اور دونوں طرف کی ساری معیشت بھی اس کی نذر ہو گئی۔ پھر اس نے کویت پر حملہ کیا اور اس حملے کا نتیجہ وہ اب تک بھگت رہا ہے۔ اب اس صورت حال سے نکلنے کا اس کے پاس واحد راستہ یہ ہے کہ عراق اقوام متحدہ کی تمام قراردادوں کو پوری طرح تسلیم کر لے۔ پچھلی دونوں جنگوں پر معذرت کا اظہار کرے اور آیندہ کے لیے واضح الفاظ میں ہر قسم کی جارحیت سے احتراز کرنے کا اعلان کرے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوڈان

سوڈان کے سربراہ جنرل عمر البشیر اپنے ہاں ایک ایسے نظام کا تجربہ کر رہے ہیں جس میں سیاسی پارٹیاں نہ ہوں۔ اپنے سب سے قریبی شریک کار جناب حسن ترابی کو انھوں نے حکومت سے الگ کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جنوب کے عیسائی اکثریت والے علاقے کی بغاوت کو کچلنے میں بھی مصروف ہیں۔ بدقسمتی سے مسلمان حکمرانوں میں سابقہ تجربات سے سیکھنے کا کوئی داعیہ نہیں ہے۔ اور اس کے بجائے رجحان یہ ہے کہ نت نئے تجربات کیے جائیں۔ جو سب کے سب چند سال بعد اپنے خالقوں سمیت ختم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ سوڈان میں بھی مسلسل تجربات ہو رہے ہیں جن کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا۔

سوڈان کو موجودہ حالت سے نکالنے کے لیے یہ لازم ہے کہ وہاں جمہوریت بحال کی جائے اور جمہوری حکومت باغیوں سے گفتگو کے ذریعے سے کسی قابل عمل سمجھوتے تک پہنچے۔

الجزائر

الجزائر پچھلے کئی سال سے خانہ جنگی کی زد میں ہے۔ یہ خانہ جنگی درحقیقت فوج کی طرف سے اسلامک سالویشن فرنٹ کو اقتدار منتقل کرنے سے انکار کے بعد شروع ہوئی۔ اس حوالے سے چار پہلو اہم ہیں۔

پہلا یہ کہ الجزائر میں ایک طویل عرصے سے آمریت تھی اور فوج پوری طرح اس کی پشت پر تھی۔ دوسرا یہ کہ آئی ایس ایف بھی جمہوریت کا سخت مخالف تھا۔ اسے جمہوریت سے صرف اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ اس کے ذریعے سے برسر اقتدار آنا چاہتا تھا۔ اس نے واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ برسر اقتدار آنے کے بعد وہ جمہوریت کا بوریا بستر گول کر دے گا۔ گویا اس کا مقصد تھا

''جمہوریت صرف ایک مرتبہ، اس کے بعد پھر آمریت'' ظاہر ہے جمہوریت ہی کے ذریعے سے جمہوریت کی بیخ کنی کو کس طرح گوارا کیا جا سکتا ہے۔ تیسرا یہ کہ اگرچہ آئی ایس ایف کو پارلیمنٹ کی نشستیں بڑی تعداد میں ملی تھیں، مگر اس کے حاصل کردہ ووٹ کل ڈالے گئے ووٹوں کا ایک تہائی تھے۔ اور چوتھا پہلو یہ ہے کہ فوج کی طرف سے مداخلت کے بعد آئی ایس ایف کے ایک بڑے دھڑے نے پرُامن جدوجہد جاری رکھنے کے بجائے مسلح کارروائیاں شروع کر دیں۔ جن کے نتیجے میں اب تک اسی ہزار سے زیادہ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔

چنانچہ الجزائر کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ ایک طرف آئی ایس ایف مسلح جدوجہد ترک کر دے اور جمہوریت پر اپنے غیر متزلزل یقین کا اظہار کرے۔ اس کے بعد حکومت عام معافی کا اعلان کر کے انتخابات کرائے اور اکثریتی پارٹی کو اس شرط کے ساتھ اقتدار منتقل کرے کہ وہ جمہوری کلچر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گی۔

آمریت بمقابلہ جمہوریت

اس وقت مسلمان ممالک عام طور پر آمریت، بادشاہت اور فوجی حکمرانوں کے شکنجے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جہاں کہیں انتخابات کی حد تک جمہوریت موجود ہے وہاں جمہوری کلچر موجود نہیں اور حکمران عموماً غیر جمہوری رویوں سے کام لیتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں کسی حد تک جمہوریت قائم ہے۔ ملائیشیا میں انتخابات کی حد تک جمہوریت ہے، مگر آزادی رائے، پریس اور عدلیہ کے ضمن میں جمہوری کلچر موجود نہیں۔ پاکستان میں جب بھی کسی حد تک جمہوریت کو آنے کی اجازت دی جاتی ہے تو حکمران اور اپوزیشن دونوں غیر جمہوری رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ ایران میں انتخابات ہوتے ہیں، مگر عوامی حکومت سے بالاتر ایک مذہبی آمریت قائم ہے۔ جو ہر چیز کو ویٹو کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ ترکی میں فوج کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ انڈونیشیا ابھی نئے نئے تجربوں سے گزر رہا ہے۔ تمام عرب ممالک میں آمریت ہے۔

اگر تمام عالم اسلام کو دنیا میں باوقار مقام حاصل کرنا ہے تو یہ لازم ہے کہ: امرھم شوریٰ بینھم کے تحت ہر جگہ جمہوری کلچر جڑ پکڑے اور باقاعدگی سے انتخابات ہوں۔ مسلمان خواص و عوام سب میں اس کا شعور بیدار کرنا ضروری ہے۔

اُمت مسلمہ کے لیے موجودہ صورت حال میں نجات کا راستہ

درج بالا بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امت مسلمہ کو موجودہ کمزور حالت سے نکلنے کے لیے درج ذیل چار نکاتی منصوبے پر عمل درآمد کرنا ہو گا۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ ہر مسلمان ملک اپنے ہاں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے تمام وسائل بروئے کار لائے۔ سائنسی تعلیم، ٹیکنالوجی اور تحقیق کو سب سے زیادہ اہمیت دے اور قوم کے ذہین طبقے کو اس کی طرف راغب کرے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مسلمان ممالک ان دس بنیادی اقدار کو اپنے ہاں سوسائٹی میں پروان چڑھائیں۔ جن کا تذکرہ اس

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تحریر کے شروع میں کیا گیا ہے۔ اوراس کے علاوہ ان پانچ اسلامی اقدار کو بھی اپنے ہاں حکمت اور تدریج کے ساتھ فروغ دینے کی کوشش کریں جن کا ذکر شروع میں کیا گیا ہے۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ تمام بین الاقوامی مسائل اور مسلمان اقلیتوں کے مسائل کو ہر ممکن حد تک پُرامن طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کی جائے اور اگر جنگ کی نوبت آئے تو (بوسنیا کی طرح) اُس اعلیٰ ترین اخلاقی معیار پر اپنے آپ کو رکھا جائے جہاں دنیا کے تمام منصف المزاج باضمیر لوگ اور ملک اس جدوجہد کی حمایت پر مجبور ہو جائیں۔

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ اس امت کا اصل کام دنیا میں اسلام کی دعوت پھیلانا ہے۔ یہ اُمت اصل میں داعی ہے اور ساری دنیا اس کی مدعو ہے۔ اگر اسلام کی دعوت اعتدال، حکمت، تدریج، محبت اور علمی سطح پر دی جائے تو یقیناً بہت سے غیر مسلموں کے دل اس کے لیے کھل جائیں گے۔ چنانچہ تمام مسلمان ممالک کو اس طرف توجہ دینی چاہیے کہ ایسے ادارے وجود میں لائیں جو ملک کے اندر اور ملک کے باہر ساری انسانیت کو اسلام سے روشناس کرائیں۔ ان کے شکوک وشبہات کا علمی سطح پر جواب دیں۔ غیر مسلموں سے مکالمہ کریں۔ ان کو اسلام کو سمجھنے کے لیے تمام آسانیاں بہم پہنچائیں۔ اس مقصد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر مسلمان اپنی جگہ پر اعلیٰ اخلاق وکردار کی مثال ہو اور وہ اپنی زندگی کے اندر متذکرہ بالا ان تمام اقدار کو ذاتی سطح پر بھی جاں گزیں کرے جو اسلام کی بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد اسلم نجمی

لفظ خلیفہ کا مفہوم

سوال: مولانا وحید الدین خان اپنی ڈائری (۱۹۹۰۔۱۹۸۹) میں لکھتے ہیں:

''پاکستان سے ایک ماہنامہ اشراق نکلتا ہے۔ اس کا شمارہ جنوری ۱۹۸۹ ہمارے سامنے ہے۔ اس کے ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ ''خلیفة'' کو جنات کا جانشین کے معنی میں لینا صحیح نہیں۔ ''خلیفة'' عربی زبان میں اصلاً اس شخص کے لیے آتا ہے جو کسی کے بعد اس کے اختیار و اقتدار کے مالک کی حیثیت سے اس کی جگہ لے۔ پھر یہ لفظ کسی کے بعد اس کی جگہ لینے کے مفہوم سے مجرد ہو کر محض اختیار و اقتدار کے مالک کے معنی میں مستعمل ہوا۔ لغت عرب میں اس معنی کے نظائر موجود ہیں...... لفظ کے معنی میں اس طرح کے تصرفات کی مثالیں عربی زبان میں عام ہیں۔ قرآن کی آیت انی جاعل فی الارض خلیفة (البقرہ) میں لفظ خلیفة صاحب اقتدار ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ صفحہ ۵۲۔

مگر پورے مضمون میں لغت یا کلام عرب سے کوئی ایک مثال بھی نہیں دی گئی ہے کہ خلیفة کا لفظ مجرد ہو کر محض اختیار و اقتدار کا مالک ہونے میں مستعمل رہا ہے۔ ہمارے علما اکثر ایسی باتیں کہتے ہیں جن کے متعلق وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ثابت کر دیا۔ حالاں کہ خالص علمی اعتبار سے وہ ثابت شدہ نہیں ہوتا۔

یہ ایک غیر سائنسی استدلال ہے جو موجودہ زمانہ میں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے علما کے لیے سائنٹفک لاجک کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ تاکہ وہ جانیں کہ ثابت شدہ ہونے کا مطلب کیا ہے اور غیر ثابت شدہ ہونے کا مطلب کیا۔ ہمارے علما کی اس کمی نے موجودہ زمانہ میں ان کے پیدا کردہ لٹریچر کو جدید انسان کے لیے بے معنی بنا دیا ہے۔'' (۱۶)

سوال یہ ہے کہ مولانا کے اس دعوے کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: مولانا وحید الدین خان نے اپنی ڈائری کے اس شذرے میں دو باتیں کہی ہیں۔

۱۔ لفظ خلیفة کے بارے میں مضمون نگار کا استدلال علمی اعتبار سے ثابت شدہ نہیں ہے۔

۲۔ کسی چیز کا ثابت شدہ اور غیر ثابت شدہ ہونا ایک سائنسی حقیقت ہوتی ہے۔ اس لیے سائنسی استدلال کے بغیر کسی چیز کا اثبات یا ابطال جدید انسان کے لیے بے معنی ہے۔

ان تمہیدی معروضات کے بعد اب ہم مولانا کے اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں۔

ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ اشراق کے مضمون نگار کا یہ دعویٰ کہ قرآن کے محولہ بالا مقام پر خلیفة کا لفظ کسی کے بعد اس کی جگہ لینے کے مفہوم سے مجرد ہو کر محض اختیار و اقتدار کا مالک کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، خالص علمی اعتبار سے ثابت شدہ دعویٰ نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنا مقدمہ ثابت کرنے کے لیے صاحب مضمون کی جانب سے لغت یا کلام عرب سے کوئی ایک مثال بھی نہیں دی گئی ہے۔

مولانا کا یہ اعتراض کہ صاحب مضمون نے لفظ خلیفہ کے معنی کی تائید میں لغت عرب سے کوئی مثال نہیں دی ہے، اس کا باعث شاید ان کا تسامح ہے ورنہ وہ اس حقیقت سے بہت اچھی طرح واقف ہیں کہ عربی زبان کے ماخذوں میں سے مستند ترین ذریعہ خود قرآن مجید ہے۔ مضمون نگار نے اس ماخذ سے نہایت واضح مثالیں پیش کر دی ہیں۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ ہر صاحب ذوق شخص معانی کے اثبات کے لیے کسی اور چیز کی احتیاج محسوس نہیں کرے گا۔ اور وہ اگر دوسرے شواہد (عربی ادب وغیرہ) کا مطالعہ کرے گا تو وہ بھی قرآن ہی کی تائید میں ہوں گے۔

القرآن یفسر بعضه بعضا [قرآن کا بعض (حصہ) اس کے بعض (دوسرے حصوں) کی تفسیر کرتا ہے] کے مسلمہ اصول کے تحت قرآن مجید سے مثالیں پیش کر دینے کے بعد لفظ خلیفہ کے مفہوم کی تعیین کی ذیل میں استدلال کے علمی ہونے پر کوئی اعتراض وارد کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس حقیقت واضح کرنے کے لیے ہم مضمون نگار کے شذرے کا پورا استدلال نقل کیے دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''لغت عرب میں اس معنی کے نظائر موجود ہیں۔ سورۂ ص میں ہے:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ۔ (۳۸:۲۶)

''اے داؤد، ہم نے تمھیں زمین میں خلیفہ (اقتدار کا مالک) بنایا ہے تو لوگوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔''

اعراف میں فرمایا ہے:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ۔ (۷:۶۹)

''اور یاد کرو جب اس نے تمھیں قوم نوح کے بعد خلفاء (اقتدار کے مالک) بنایا۔''

اس سے فعل استخلف بھی اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ نور میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِھِمۡ۔ (۲۴:۵۵)

''اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے فی الواقع ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے کہ وہ انھیں اس سرزمین میں ضرور خلیفہ بنائے گا، جیسا کہ اس نے ان لوگوں کو خلیفہ بنایا (یعنی اقتدار بخشا) جو اس سے پہلے گزرے۔''

لفظ کے معنی میں اس طرح کے تصرفات کی مثالیں عربی زبان میں عام ہیں۔ مثلاً وارث اور میراث عربی زبان کے دو معروف لفظ ہیں۔ یہ اصلاً، بے شک، ترکے کا مالک، اور ترکہ کے لیے آتے ہیں۔ لیکن محض 'مالک'، اور 'ملک' کے معنی میں بھی ان کا استعمال لغت عرب میں ثابت ہے۔ سورۂ حجر میں ہے:

وَاِنَّا لَنَحۡنُ نُحۡیٖ وَ نُمِیۡتُ وَ نَحۡنُ الۡوٰرِثُوۡنَ۔ (۱۵:۲۳)

''اور بے شک ہم ہی زندہ کرتے اور مارتے اور ہم ہی سب کے وارث (مالک) ہیں۔''

آل عمران میں فرمایا ہے:

وَ لِلّٰہِ مِیۡرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ۔ (۳:۱۸۰)

''وہ اللہ ہی کی میراث (ملک) ہیں یہ آسمان اور زمین اور اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال سے بے خبر ہے۔''

قرآن مجید کی آیت: انی جاعل فی الارض خلیفۃ میں لفظ خلیفۃ ہمارے نزدیک، صاحب اقتدار ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ میں اسے بنانے والا ہوں جو زمین میں اقتدار کا مالک ہوگا۔ فرشتوں نے اس اقتدار کے لازمی نتیجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا: کیا آپ اسے بنائیں گے جو زمین میں فساد کرے اور خون بہائے؟

انسان کی حیثیت اس زمین پر فی الواقع یہی ہے۔ اسے یہ اقتدار اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہے۔ قرآن مجید کی اس حیثیت کا اثبات کرتا ہے۔ لیکن وہ اسے بتاتا ہے کہ زمین و آسمان کا اصل بادشاہ وہی ہے جس نے اسے یہ اقتدار بخشا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرے اور اختیار و اقتدار کے باوجود اپنے مالک کا بندہ بن کر رہے۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ لفظ خلیفہ کو اس آیت میں اللہ کا نائب، یا جنات کا جانشین کے معنی میں لینا کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ آیت میں یہ نکرہ استعمال ہوا ہے۔ نیابت یا جانشینی کے معنی کے لیے عربیت کی رو سے ضروری تھا کہ یہ مضاف الیہ کی صراحت کے ساتھ یا لام سے معرف ہو کر آتا۔'' (اشراق، جنوری ۱۹۸۹، ۵۲۔۵۳)

لفظ خلیفہ کے اختیار و اقتدار کی حامل ہستی کے معنوں میں استعمال کے لیے مضمون نگار کے استدلال سے آگاہی کے بعد

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مولانا کے اعتراض پر کسی تبصرے کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔

دوسرے اعتراض کے ضمن میں مولانا نے جدید انسان کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس سے غالباً ان کی مراد دورِ حاضر کا انسان ہے۔ علم کی ترقی، تجربے کی امتداد اور مشاہدے کی وسعت نے اس کے سوچنے کے طریقوں، چیزوں کے دیکھنے کے انداز، معاملات کو سمجھنے کی صلاحیتوں اور حالات کا تجزیہ کرنے اور نتائج نکالنے کی اہلیت میں اضافے کے باعث جدید انسان نے بلاشبہ زندگی کو بہت سے نئے زاویوں سے دیکھا ہے۔ مگر فطری حقائق کے بارے میں اس کا رویہ ہمیشہ کی طرح حقیقت پسندانہ رہا ہے۔ اس نے انھیں اپنے اسلاف کی طرح مستقل حیثیت دی ہے۔ ان میں کسی تغیر یا تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ان کی صحت یا عدم صحت کا مسئلہ کبھی اس کے ہاں نہیں آیا۔ ان حقائق پر انسانیت کے اجماع کو اس نے بلاتردد اور برضا و رغبت قبول کیا ہے۔

اسلام اپنے ماننے والوں میں جو رویہ پیدا کرنا چاہتا ہے وہ فطری حقائق پر مبنی ہے، یہ حقائق ابدی اور غیر متبدل ہیں لہٰذا یہ رویہ اختیار کرنے کے بعد بندۂ مومن قدیم و جدید کی بحث کا موضوع ہی نہیں بنتا۔ وہ بس مستقل اہمیت کی حامل اعلیٰ اقدار سے مزین ایسی ہستی ہوتی ہے جو ہر دور اور ہر زمانے میں شرف و عزت کا اعلیٰ ترین معیار قرار پاتی ہے۔

انسان کا جدید یا قدیم ہونا اس کا عمرانی معاملہ ہے۔ یہ کوئی دینی یا اخلاقی مسئلہ نہیں ہے۔ اور اسلام اس پہلو سے بنیادی اور اصولی ہدایات دے دینے کے بعد اسی وقت دراندازی کرتا ہے جب کوئی اخلاقی مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

حقائق ثابت کرنے کے لیے انسان نے استدلال کی جو تاریخ رقم کی ہے وہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ اس بارے میں بس اتنا عرض کرنا ہے کہ فاضل مضمون نگار نے لفظ خلیفہ کی تحقیق میں اپنا نقطۂ نظر جس طرح دلائل و براہین کے ساتھ واضح کیا ہے وہ ہر اعتبار سے علمی استدلال ہے[1]۔ اسے سائنسی یا غیر سائنسی استدلال کی بحث میں الجھانا ہی درست نہیں ہے۔ یہ زبان و بیان کا مسئلہ ہے اور ایسے مسائل میں اہل دانش علمی استدلال کرتے ہیں۔ کسی چیز کو اگر عقل و فطرت، دلائل و شواہد اور آثار و قرائن کی بنیاد پر صحیح ثابت کر دیا جائے تو وہ چیز ایک علمی حقیقت قرار پاتی ہے۔ اس سے اختلاف تو ممکن ہے مگر اسے غیر علمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سائنسی استدلال اصلاً ریاضیاتی استدلال ہوتا ہے اور زبان و بیان کی نزاکتیں اس کی متحمل نہیں ہو سکتیں کیونکہ زبان منطق نہیں نطق ہوتی ہے اور نطق میں بس علمی استدلال ہی معتبر ہوتا ہے۔

---

1. سائنسی استدلال سے مراد مولانا کی مراد بھی علمی استدلال ہی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مجلس نبوی کے آداب

''(اِن فتنوں سے بچنے کے لیے)، اے ایمان والو، (تم بارگاہِ رسالت میں بیٹھو تو) 'راعنا' نہ کہا کرو، 'انظرنا' کہا کرو اور (جو کچھ کہا جائے، اُسے) توجہ سے سنو، اور (اِس بات کو یاد رکھو کہ) اِن کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اہل کتاب ہوں یا مشرکین، اِن میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے، وہ نہیں چاہتے کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے کوئی خیر تم پر نازل کیا جائے۔ اور (یہ احمق نہیں جانتے کہ) اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے، اور (نہیں جانتے کہ) اللہ بڑی عنایت فرمانے والا ہے۔

(اِنھیں اعتراض ہے کہ تورات کی شریعت میں ہم کوئی تبدیلی کیوں کرتے ہیں۔ اِنھیں بتا دو)، ہم (اِس کتاب کی) جو آیت بھی منسوخ کرتے ہیں یا اُسے بھلا دیتے ہیں، (قرآن میں) اُس کی جگہ اُس سے بہتر یا اُس جیسی کوئی دوسری لے آتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے، (اے لوگو) کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کی پادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مدد کرنے والا۔'' (۲: ۱۰۴-۱۰۷)

مدعا یہ ہے کہ یہ یہود ہمارے اِس نبی پر کیا ایمان لائیں گے اور کیا تقویٰ کی راہ اختیار کریں گے۔ اے مسلمانو، تم اپنے دامن کی فکر کرو۔ یہ لوگ تمھاری محفلوں میں آ کر بڑے شنیع طریقوں سے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں، تم اِن سے خبردار رہو اور انھیں کوئی موقع نہ دو۔ دیکھو یہ تمھارے نبی کے پاس آتے اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ ہم علم کے سچے طالب اور حق کی تلاش میں سرگرداں ہیں، اے محمد تیری محفل میں آئے ہیں، تو بات کرتا ہے، ہم تیری بات سنتے ہیں، تو نے بات کرتے ہوئے ابھی یہ کیا کہا تھا، کان تو پڑا پر سنائی نہ دیا، ہماری کچھ رعایت کریں پھر سے کہیں، ہم بھی جان لیں ہم بھی سمجھ لیں، تم فہم و فراست کی کہتے اور عقل و دانش کی بات کرتے ہو۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہ لوگ اپنا یہ تاثر تمھارا مجلسی لفظ 'راعنا' بول کر ظاہر کرتے ہیں۔ خوش گمان یہ سمجھتا ہے کہ یہ رعایت چاہتے ہیں۔ لیکن غور کرو، نہ یہ کسی رعایت کے مستحق ہیں، نہ یہ کوئی رعایت چاہتے ہیں۔ یہ راعنا (ہماری رعایت کریں) کا لفظ نہیں راعینا (ہمارے چرواہے) کا لفظ بولتے ہیں، تاکہ یہ شہنشاہِ ارض و سما کے رسول کا مذاق اڑائیں اور اُس کے ذریعے سے اِن پر جو اتمامِ حجت ہو رہا ہے اُس کے ردِ عمل میں اُس کی توہین کریں اور اُس کو مسلمانوں کی نگاہ سے گرانے کی کوشش کریں۔

اے ایمان والو، اِن فتنوں سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تم جب بھی اپنے نبی کے پاس بیٹھو اور تمھیں اُس سے بات سمجھنے کے لیے اُسے اپنی طرف متوجہ کرنا اور کوئی بات دوبارہ سننا پیشِ نظر ہو تو 'راعنا' کے الفاظ نہ کہا کرو، بلکہ 'انظرنا' کہہ دیا کرو، اور ہاں جو کچھ بھی کہا جائے، اُسے پہلے ہی سے توجہ سے سنا کرو۔ لازم ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو اِن شنیع حرکتوں سے بہت دور رکھیں۔

اے مسلمانو! تم خود کو بچاؤ اور اِس بات کو یاد رکھو کہ تمھارے پروردگار نے ایسے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یہ تمھارے اردگرد کے اہلِ کتاب ہوں یا مشرکین، اِن میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے، وہ اِس غصے اور اِس حسد میں جل رہے ہیں کہ تم خدا کی طرف سے اِس خیرِ عظیم کے حق دار کس طرح قرار پا گئے، وہ نہیں چاہتے کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے کوئی خیر تم پر نازل کیا جائے۔ اُن کے خیال میں سارا خیر اور سارا شرف تو اُن کی وراثت تھا، نہ کہ اِس قلاش نبی اور اِس کے اِن بے سروسامان ساتھیوں کی۔ اُن کے خیال میں اللہ نے یہ غلط فیصلہ کیا ہے کہ اِس بھلائی سے تمھیں بہرہ مند کر دیا ہے۔ مسلمانو، تم اِن کی چالوں سے ہوشیار رہو۔

افسوس یہ احمق یہ بات نہیں جانتے کہ اللہ بڑی حکمت کا مالک ہے، وہ اپنی حکمت سے جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے، اور کیا انھیں معلوم نہیں کہ اللہ بڑی عنایت فرمانے والا ہے، کیا یہ اُس کو تمھارے حق میں بخل کا مشورہ دینا چاہتے ہیں، یہ نہیں جانتے کہ وہ بڑے فضل والا ہے وہ جو فیصلہ اپنی حکمت اور رحمت سے کرے گا پھر وہ کسی کے مشورے سے اُس میں کوئی بخل کیوں برتے گا۔

انھیں یہ اعتراض بھی ہے کہ تورات کی شریعت میں خدا کوئی تبدیلی کیوں کرتا ہے۔ اگر تورات اُسی کی نازل کردہ ہے تو پھر کیا اُسے اب کسی تجربے نے کچھ سجھا دیا ہے، جسے وہ پہلے نہیں جانتا تھا اور اب اُس نے جان لیا ہے، یہ کیسا خدا ہے جس سے محمد کا قرآن ہمیں متعارف کرا رہا ہے۔ اے مسلمانو، یہ لوگ اِس طرح کے اعتراضات کر کے تمھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ تم انھیں چھوڑ دو اور کوئی بھی اُن کی بات نہ سنے، وہ تنہا رہ جائیں۔

انھیں بتا دو، کہ خدا تمدن کے ارتقا اور حالات کی تبدیلی کے پیشِ نظر اِس کتاب تورات کی جو آیت بھی منسوخ کرتا ہے یا اُسے بھلا دیتا ہے، قرآن میں اُس کی جگہ اُس سے بہتر یا اُس جیسی کوئی دوسری آیت لے آتا ہے۔ ایسا نہیں کہ اُس نے

انسانوں کے لیے اپنی ہدایت اور اپنی شریعت میں کوئی کمی کر ڈالی ہے۔

اے لوگو، کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ کسی کو شریعت دینے کے بعد اپنی قدرت اور اپنے اختیار سے دست بردار نہیں ہو جاتا، وہ جب چاہتا ہے اور جس ذریعے سے چاہتا ہے، دنیا کو اپنی شریعت دیتا ہے، اور پھر اُس میں اپنی حکمت سے جب بھی کوئی تبدیلی چاہتا ہے، کر ڈالتا ہے۔

اے یہود، جان لو، آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے، اُس نے تمھیں اپنی شریعت کا حامل بنایا تھا، پر تم اُس کے اہل ثابت نہ ہو سکے، اب اُس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ ایک دوسری قوم کو اِس منصب پر سرفراز کرے گا۔ اُس کا یہ فیصلہ تمھارے غم و غصہ کے باوجود، نافذ ہو کر رہے گا۔ تمھارا کوئی حامی اور کوئی مددگار بھی اللہ کے اِس فیصلے کو ہٹانے میں تمھاری مدد نہیں کر سکتا۔

______ محمد رفیع مفتی

خدا سے دعا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

''اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت بخشنے کے بعد کبھی کج نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش۔ تو نہایت بخشنے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! تو سب لوگوں کو ایک ایسے دن کے لیے جمع کر کے رہے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔'' (آل عمران ۳: ۸۔ ۹)

قرآن مجید میں یہ ان لوگوں کی دعا نقل ہوئی ہے جو واقعی اہل علم ہیں اور انھیں اپنے علم میں رسوخ (پختگی) حاصل ہے۔

یہ دنیا آزمایش کے اصول پر بنائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادے کی آزادی اور اختیار دے کر ہدایت و ضلالت میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب اس کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ دونوں راستے اس کے سامنے واضح ہیں۔ اس کی آزمایش یہ ہے کہ وہ کسی خارجی جبر کے بغیر اپنے لیے دونوں میں سے کسی ایک راہ کا انتخاب کرے۔ خدا کی مرضی یہ ہے کہ وہ سیدھی راہ پر چلے۔ وہ جب یہ راہ اختیار کر لیتا ہے تو شیطان اور اس کے حواری اسے راہ حق سے ہٹانے اور گمراہی کی راہ پر ڈالنے کے لیے کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ انسان کے لیے بسا اوقات یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ اپنے ان ازلی دشمنوں سے اللہ کی تائید و نصرت کے بغیر مقابلہ کر سکے۔

پہلی آیت میں بندوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ جب شکوک و شبہات کے نرغے میں آ جائیں اور ان کا ایمان و اسلام

خطرے میں ہو تو اپنے اللہ سے مدد کی دعا کریں۔ اور وہ یہ دعا ہمیشہ کرتے رہیں تاکہ دین میں انھیں اطمینان حاصل رہے۔ صراط مستقیم پر ان کے جمے ہوئے قدم اکھڑنے نہ پائیں اور فتنوں کے حملے کے وقت خدا کی مدد پہنچتی رہے۔ بس یہی وہ طریقہ ہے جس سے وہ راہ حق میں ثابت قدم رہ سکتے ہیں۔

دوسری آیت میں آخرت پر بندے کے غیر متزلزل یقین کا اظہار ہے۔ غور کیجیے تو آخرت پر سچا ایمان اور پختہ یقین ہی ہے جو انسان کے دل کا محافظ، دماغ کا رہنما اور عقل کا پاسبان ہے۔ انسان اگر اس یقین سے محروم ہو جائے تو پھر فکر و نظر کی گمراہی سے بچنا ممکن نہیں رہتا۔ پھر وہ زندگی کو ایک آسان بازی سمجھنے لگتا ہے اور اسے دنیا کے داؤ پر لگا دیتا ہے۔ یہ چیز بالآخر اسے آخرت میں خدا کی جنت سے محروم کر دیتی ہے۔

وہ لوگ جن کے دل و دماغ میں آخرت کا یقین رچا بسا ہوتا ہے، وہ دنیا میں ہر قدم احتیاط کے ساتھ اٹھاتے، پھونک پھونک کر قدم رکھتے اور یہ یقین کر کے آگے بڑھتے ہیں کہ وہ واقعی صراط مستقیم پر گام زن ہیں۔ وہ شیطان کے حملوں سے ہمیشہ اندیشہ ناک رہتے ہیں۔ ان حملوں سے بچنے کی دعا ان کا شب و روز کا معمول ہوتا ہے اور وہ راہِ حق میں ثابت قدمی اور استقامت کے لیے اللہ ہی سے مدد کے طالب ہوتے ہیں۔

______ محمد اسلم نجمی

نبی کریم کا عورتوں سے خطاب

''حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ یا عید الفطر کے روز عید گاہ کی طرف روانہ ہوئے تو ان کا گزر عورتوں (کے ایک گروہ) کے پاس سے ہوا۔ (آپ کچھ دیر کے لیے وہاں رکے اور انھیں خطبہ دیتے ہوئے) آپ نے ارشاد فرمایا: اے عورتو، تم زیادہ سے زیادہ خیرات کیا کرو، کیوں کہ (مجھے رویا میں دکھایا گیا کہ) عورتیں جہنم میں زیادہ ہیں۔ (اس پر) انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول ایسا کیوں ہے (یعنی ہماری کس غلطی کی وجہ سے ایسا ہے)؟ آپ نے فرمایا: تم لعن طعن بہت کرتی ہو اور اپنے خاوندوں کی ناشکری کرتی ہو۔ دین اور دنیا کی ذمہ داری میں اتنی کمی کے باوجود[1] میں

---

[1] حدیث میں اس کے لیے ''ناقصات عقل و دین'' کے الفاظ آئے ہیں۔ عربی زبان میں عقل اور دین کے الفاظ جب اس طرح استعمال ہوتے ہیں تو اس سے دین اور دنیا مراد ہوتے ہیں۔ عربی کے اس اسلوب کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اس حدیث سے غلط نتیجہ نکالا گیا اور عورت کو

نے ہوشیار اور پختہ ارادے والے بندے کو تم سے بڑھ کر گمراہ کر دینے والیاں نہیں دیکھیں۔ عورتوں نے پوچھا: ہمارے دین اور دنیا کی ذمہ داریوں میں کمی کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا (دستاویزی) شہادت میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی نہیں ہوتی۔ انھوں نے کہا: ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ تمھاری دنیا کی ذمہ داریوں میں کمی کی مثال ہے۔ (اس کے بعد) آپ نے فرمایا: کیا ایسا نہیں ہے کہ عورت حالت حیض میں نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں! ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ تمھاری دینی ذمہ داریوں میں کمی کی مثال ہے۔'' (مشکوٰۃ، رقم ۱۹)

یہ غالباً اس موقعے کی بات ہے جب آپ نمازِ عید کے لیے نکلے۔ پہلے آپ نے مردوں کو خطبہ دیا اور پھر عورتوں کو کچھ نصیحتیں کیں۔ اس حدیث میں جو باتیں بیان ہوئی ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ نے بس یہی کچھ فرمایا ہوگا۔ آپ نے اس موقع پر اور بہت سی نصیحتیں کی ہوں گی، مگر راوی نے اپنے ذوق کے مطابق اور اپنی پسند کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کی حامل باتوں کو منتخب کیا اور انھیں بیان کر دیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی بھی آتی تھی اور بعض حقائق رویا (خواب) کے ذریعے سے بھی دکھائے جاتے تھے تاکہ آپ لوگوں کو نصیحت کریں اور انھیں دینی لحاظ سے دنیا و آخرت کے بعض اہم پہلوؤں کی جانب توجہ دلائیں۔ اس حدیث میں اسی قسم کے ایک رویا کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔

دوزخ میں عورتوں کی اکثریت کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو وجوہ بیان فرمائے ہیں:

۱۔ وہ لعن طعن بہت کرتی ہیں۔ یہ ان کے بات بے بات طیش میں آ جانے، بات کرتے ہوئے احتیاط نہ برتنے، الزام دینے، بہتان باندھنے اور چغلی کھانے میں زیادہ دلچسپی لینے اور عدمِ تربیت اور احتیاط نہ کرنے کے باعث رازوں کی پاس داری میں لاپروائی کا رویہ اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ وہ اپنے خاوندوں کی ناشکر گزار ہوتی ہیں۔ شوہر انھیں ساری عمر کما کر کھلاتا ہے اور ان کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ لیکن حالات کی ناسازگاری کے باعث اگر رزق میں تنگی پیدا ہو جائے اور بعض ضرورتیں پوری نہ ہو سکیں تو ایسی صورت میں ان کا رویہ بالعموم ناشکری کا ہوتا ہے اور وہ سابقہ زندگی کی رفاہیت کو نظر انداز کر کے بسا اوقات ایسے تبصرے کرتی ہیں جن سے یہ تاثر ملتا ہے کہ انھیں اپنے خاوند کے گھر میں کبھی سکھ کا سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ سبھی عورتیں ایسی ہوتی ہیں۔ یہ دراصل عورتوں کا عمومی رویہ بیان ہوا ہے۔ ورنہ تو کتنی ہی عورتیں ایسی ہیں جو نہایت نیک سیرت، پاک باز اور اپنی زبان اور رازوں کی حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں اور کتنے ہی مرد

ناقص العقل قرار دے دیا گیا۔ یہ چیز عقل و فطرت کے مسلمات، دین و شریعت کی تعلیمات اور انسان کو اس دنیا میں درپیش آزمایش کی حکمت کے خلاف ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ایسے ہیں جو کم ظرفی، رازوں کی پاس داری میں لاپروائی اور دوسروں کی عیب جوئی کے معاملے میں عورتوں سے کہیں بڑھ کر ہوتے ہیں۔

_____ محمد اسلم نجمی

انفاق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں میں قسم کھاتا ہوں (کہ وہ ہر حال میں ہوکر رہیں گی، ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ) جس نے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا تو اس کے مال میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ (دوسری یہ کہ) کسی پر ظلم ہوا اور وہ مظلوم (یعنی بے گناہ بھی) ہو اور پھر وہ اس پر صبر کرے تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ اس کی عزت میں اضافہ نہ کرے۔ اور (تیسری یہ کہ) جب کوئی آدمی اللہ کو چھوڑ کر اوروں سے مانگنے نکل کھڑا ہو تو اللہ اس پر تنگ دستی کے دروازے کھول دیتا ہے (یعنی اسے تنگ دست بنا دیتا ہے)۔ (اس کے بعد فرمایا) میں تمھیں ایک بات بتاتا ہوں، اسے یاد رکھو (پھر وہ بات یوں بیان کی کہ) اس دنیا میں چار طرح کے لوگ رہتے ہیں: (ایک) وہ بندہ جسے اللہ نے مال اور علم دیا ہو اور وہ (اپنے علم کے ذریعے سے)، اللہ کا تقویٰ اختیار کرے اور (اپنے مال کے ذریعے سے) صلہ رحمی کرتا ہو، اور اسے احساس ہو کہ (جو علم اور مال اسے عطا ہوا ہے) اس میں اللہ کا حق بھی ہے۔ اور (دوسرا) وہ بندہ جسے اللہ نے علم عطا کیا ہو، مگر اسے مال نہ دیا ہو اور (مال سے محرومی کے باوجود) وہ نیک نیت ہو اور یہ خیال کرتا ہو کہ اگر اس کے پاس مال ہوتا تو فلاں (خدا کی راہ میں انفاق کرنے والے) کی طرح خرچ کرتا۔ ایسے شخص سے اس کی نیت کے مطابق معاملہ ہوگا اور ان دونوں کا اجر برابر ہوگا۔ اور (تیسرا) وہ جسے اللہ نے مال دیا مگر علم سے محروم رکھا اور علم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے مال (کے نشے میں) سرمست ہو گیا، وہ (اپنے) اس (مال کے معاملے) میں نہ اللہ سے ڈرتا ہے (یعنی اسے بے جا اسراف و تبذیر میں اڑا دیتا ہے)، نہ صلہ رحمی کرتا ہے اور نہ مال میں اللہ کا حق پہچانتا ہے (یعنی اللہ کے راستے میں انفاق نہیں کرتا) تو یہ شخص بدترین مقام پر ہے۔ اور (چوتھا) وہ شخص جسے اللہ نے مال اور علم دونوں سے محروم رکھا اور وہ (محض مال سے محرومی پر حسرت کرتے ہوئے) کہتا ہے: اگر اس کے پاس مال ہوتا تو فلاں (خدا فراموش شخص) کی طرح (مال کو عیش و عشرت میں) خرچ کرتا۔ ایسے شخص کے ساتھ بھی اس کی نیت کے مطابق سلوک ہوگا، اور ان دونوں کے گناہوں کا بوجھ یکساں رہے گا۔ (ترمذی، رقم ۲۲۴۷)

اس حدیث کی ابتدا اللہ کے راستے میں انفاق کی تعلیم سے ہوئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ دین میں خدا کی راہ میں خرچ کرنا کتنی اہمیت کا حامل ہے۔

انفاق کے بارے میں آپ کا یہ فرمانا کہ جس نے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا، وہ جان لے کہ اس کے مال میں کوئی کمی نہیں ہوئی، یہ بات عجیب لگتی ہے۔ بظاہر خرچ کرنے سے مال کم ہوتا ہے، مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اسے یوں سمجھ لیں کہ جیسے کسی شخص کے پاس مال ہو اور وہ اس میں سے کچھ رقم بنک میں جمع کرا دے تو اگرچہ اس کے پاس بظاہر روپیہ کم ہو گیا، مگر دوسری جگہ پر روپیہ اس کے نام پر محفوظ ہو گیا۔ اس لیے اس کے مال میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، بلکہ اس کی جو رقم بنک میں پڑی ہے، وہ زیادہ محفوظ ہے۔ اسی طرح اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہوا مال ہی اصلاً محفوظ ہے۔ پھر یہی نہیں کہ اصل زر محفوظ ہوا ہے، بلکہ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ آخرت کے بنک میں جمع ہونے والے مال پر اس طرح منافع دیں گے کہ اسے کئی گنا بڑھا دیں گے۔

کتنے بدنصیب ہیں وہ لوگ جن کے اس دنیا کے بنکوں میں کروڑوں روپے جمع ہیں، مگر موت کے بعد جب وہ خدا کے حضور حاضر ہوں گے تو آخرت کے بنک میں ان کے حساب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ ہو گی۔ اور کتنا خوش بخت ہے وہ شخص جو اپنے مال کو خدا کی امانت خیال کرتا ہے اور محروموں کو اس میں حصہ دار بناتا ہے۔ ایسا شخص قیامت میں خدا کی جنت میں داخل ہو گا اور آخرت کی ابدی بادشاہی کا حق دار قرار پائے گا۔

اس حدیث میں دوسری اہم بات یہ بیان ہوئی ہے کہ اصل عزت خدا سے تعلق قائم کرنے اور اس کی مرضی پر چلنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس راہ پر چلتے ہوئے کسی شخص کو اگر کسی تکلیف یا پریشانی کا سامنا کرنا پڑے اور کوئی اسے محض اپنے مال و دولت اور اثر و اقتدار کے بل پر رسوا کرنا چاہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کی یہ کوشش خدا کی مرضی کے خلاف ہو گی۔ ایسا شخص اگر ظلم و زیادتی کے باوجود صبر کرے اور صراطِ مستقیم پر قائم رہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ خدا کی نظر میں برگزیدہ ہو گا اور دنیا میں بھی صاحب عزت قرار پائے گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ دنیا میں رزق اور وسائل کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے بندوں میں فرق اور تفاوت قائم رکھا ہے۔ یہ خدا کی مشیت اور اس دنیا میں درپیش آزمایش کی ضرورت ہے۔ اس حدیث میں محروموں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور میسر اسباب کو جائز طریقوں سے استعمال میں لانے کے بعد جو کچھ حاصل کر پائیں اس پر قناعت کریں۔ اور اگر ناگزیر ضرورتوں کے لیے ہاتھ پھیلانا پڑ جائے تو بس اللہ ہی کے سامنے دست سوال دراز کریں، اور اسی کے دروازے پر دستک دیں۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ بندے کو وہاں سے رزق مہیا کر دیتا ہے، جہاں سے اسے سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ (۶۵:۳) اس کے برخلاف بندہ اگر رزق کی تنگی سے گھبرا جائے اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے غلط روش اختیار کر لے اور غیر اخلاقی اور غیر قانونی طریقوں سے دولت کمانے کے درپے ہو جائے اور عالم کے پروردگار پر اعتماد کھو بیٹھے اور مخلوق میں سے کسی کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ لے تو ایسے شخص کے لیے خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ لازماً رسوا ہو گا اور زندگی بھر تنگ دستی سے چھٹکارا نہ پا سکے گا۔ یہ رویہ اختیار کر کے وہ گویا اللہ کے مقابلے میں دوسروں کو رازق مانتا اور انھیں خدا کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ یہ ایسا جرم ہے جس کا نتیجہ دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں خدا کی ناراضی ہو گا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کی درجہ بندی کر کے ان کے رویوں کو نہایت خوبی کے ساتھ نمایاں کیا ہے:

برے اعمال میں تو نیت اچھی بھی ہو تو ان کی برائی میں کوئی فرق نہیں آتا، البتہ نیک اعمال میں اصل اعتبار نیت کا ہے۔ اچھا کام اگر خدا کے لیے کیا جائے تو اس کا اجر آخرت میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر عملِ صالح کے پیچھے نیت بری ہو تو ایسا عمل خدا کے ہاں بے وزن قرار پاتا ہے۔

نیت کی پاکیزگی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بندہ جس کے ساتھ بھلائی کر رہا ہے، اسے اپنا محسن سمجھے، اس لیے کہ اس نے اسے نیکی کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ اس لیے وہ نہ اس پر احسان جتائے اور نہ اسے اذیت دے۔

اللہ نے یہ دنیا آزمایش کے لیے بنائی ہے۔ یہاں لوگوں کو علم و مال وغیرہ کی صورت میں جو کچھ ملا ہے، وہ ان کے استحقاق کی بنیاد پر نہیں، بلکہ آزمایش کی غرض سے عطا ہوا ہے۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پانے والوں اور محروم رہنے والوں کا خدا کی نظر میں پسندیدہ رویہ نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

وہ لوگ جنھیں اللہ نے اس دنیا میں علم کی دولت، اسباب و وسائل اور مال و منال وغیرہ سے محروم رکھا ہے، وہ بظاہر ان سے کم تر نظر آتے ہیں، جنھیں یہ سب کچھ یا اس میں سے کچھ ملا ہے۔ دنیا کے اعتبار سے یہ فرق مراتب بہر حال قائم رہے گا، مگر محرومین اگر قرآن و سنت کا لحاظ رکھتے ہوئے آپ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی میں صحیح رویہ اختیار کریں تو وہ آخرت کے اجر میں پانے والوں کے برابر ہو سکتے ہیں۔

محرومین کی آزمایش بھی اگرچہ آسان نہیں ہے، مگر علما اور اہل ثروت کی ذمہ داریاں زیادہ سخت اور بہت نازک ہیں۔ انھیں اپنی بہت سی تمناؤں، آرزووں اور خواہشوں کو قربان کر کے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے مقابل محرومین کو بس اپنی نیت کو پاک صاف رکھنا اور صبر و شکر کا رویہ اختیار کرنا ہے۔ اس کے بعد، امید ہے کہ وہ آخرت کے اجر میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔

_____ محمد اسلم نجمی

خدمت خلق

انسان کی فطرت ہے کہ وہ امیدوں کے سہارے جیتا ہے۔ یہ امیدیں اسے اپنے ہم نفسوں سے ہوتی ہیں۔ بعض لوگ دوسروں کی توقعات پر پورا اترنے کو زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں۔ وہ کسی کی زندگی میں عین اس وقت امید کی شمع روشن کر دیتے ہیں جب اسے ہر طرف اندھیرا نظر آتا ہے۔ یہ معاشرے کے وہ لوگ ہیں جنھوں نے جان لیا ہے کہ انسان کے احساس کو

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

معراج اس وقت حاصل ہوتی ہے، جب وہ دوسروں کے دکھ کو محسوس کرنا شروع کر دے اور نظر کو رفعت اس وقت عطا ہوتی ہے، جب اسے اپنی ذات سے باہر، دوسروں کی تکالیف نظر آنا شروع ہو جائیں۔ اور احساس و نظر کی معراج حاصل کرنے کا واحد ذریعہ خدمت خلق ہے۔

خدمت خلق تنظیمیں بنا کر کرنا ہی ضروری نہیں، بلکہ یہ وہ سامان ہے جو کسی غریب بچی کی رخصتی کا سبب بن سکے، وہ دس بیس روپے کی دوا ہے جو کسی بیمار کو صحت یاب کر سکے اور وہ لقمہ ہے جو کسی بھوکے کو زندگی دلا سکے۔ سو بہت بڑے بڑے اداروں ہی سے نہیں، بلکہ یہ معراج ہر انسان اپنے گرد و پیش میں حاصل کر سکتا ہے۔ بات صرف اس احساس کی ہے۔ یہ احساس ان لوگوں کی متاع ہے جو اپنی زندگی دوسروں کے آرام کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ کسی کے لیے اپنی زندگی وقف کرنا اس وقت اور بھی آسان ہو جاتا ہے، جب انسان یہ جانتا ہو کہ جس زندگی میں وہ سانس لے رہا ہے، یہ منزل نہیں، سفر ہے۔ اور یہ کہ حقیقی زندگی کا آغاز اس زندگی کے اختتام سے مشروط ہے۔ اور اس سفر کے لیے زادِ راہ میں وہ اعمال بھی شامل ہیں جو کسی دوسرے کے لیے فائدہ مند ہوں۔ جو لوگ اس بات سے واقف ہیں، وہ اس سامان سفر کے حصول کے لیے اپنی نیندیں، اپنا آرام، اپنی خوشی سب پیش کر دیتے ہیں۔

خدمت خلق کا احساس اجتماعی سوچ سے پیدا ہوتا ہے، مگر ہمارے معاشرے میں انفرادی مسائل کو اجتماعی مسائل پر ترجیح دی جاتی ہے۔ ملاوٹ کرنے والا یہ نہیں سوچتا کہ اس سے وہ تو فائدہ حاصل کرے سکے گا، مگر کوئی بیمار بھی پڑ سکتا ہے۔ جعلی ادویات بنانے والا یہ نہیں سوچتا کہ اس کی دولت سے زیادہ اہم کسی کی جان ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو تو ہم چور، ڈاکو، قاتل وغیرہ کے نام دے سکتے ہیں، مگر اس اجتماعی مسئلے میں ہم سبھی کسی نہ کسی حیثیت سے گناہ گار ہیں۔ ایک غریب کو دھتکارنے سے پہلے ہم یہ نہیں سوچتے کہ ان چند روپوں کے دینے سے شاید ہماری زندگی پر تو کوئی اثر نہ پڑے، مگر اس غریب کی زندگی پر ضرور پڑے گا۔ اسے صرف کھانا ہی نہیں، بلکہ زندگی میسر آ سکے گی، وہ اپنی بیٹی کی رخصتی کا بندوبست کر سکے گا یا اپنے بوڑھے ماں باپ کی دوا لا کر انھیں موت سے بچا سکے گا۔

سو اصل بات دوسروں کے مسائل کو سمجھنا اور ان کا حل تلاش کرنا ہے۔ یہ عمل خواہ کسی بھی سطح پر ہو، بہرحال خدمت خلق قرار پائے گا۔

______ معاذ احسن غامدی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد بلال

''مغرب سے مشرق تک''

کینیڈا، امریکا اور سعودی عرب کا سفرنامہ

مصنف: ریحان احمد یوسفی

صفحات: ۲۳۹

قیمت: ۲۰۰ روپے

ناشر: الکتاب پبلشرز ۲/۹ ابراہیم مارکیٹ پی آئی بی کالونی کراچی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عام ادیب فکر انگیز اور دل نشیں اسلوب میں حیات و کائنات کی بڑی بڑی حقیقتوں کے بارے میں سوال اٹھاتا، دوسروں کو ان کی تہ میں اترنے پر ابھارتا اور فکر و خیال کے نئے دریچے وا کرتا ہے، مگر بالعموم قاری کو تشکیک و گمان کے گورکھ دھندے میں الجھا دیتا ہے۔ جبکہ خاص ادیب بالفاظ دیگر باشعور مسلمان ادیب کے طاق قلب میں چونکہ وحی الٰہی کی قندیل روشن ہوتی ہے، اس لیے وہ اس کی روشنی میں حیات و کائنات پر غور کرتا اور دوسروں کو غور کرنے کی دعوت دیتا ہے اور یوں قاری کے سامنے حق و صداقت کی واضح اور روشن شاہراہ نمایاں کر دیتا ہے۔

ریحان احمد یوسفی سوچنے، کڑھنے اور لکھنے کا درد بے دوا پانے والے نوجوان اور شہر ادب میں نو وارد خاص ادیب ہیں۔

جب بھی کوئی شخص سفر سے لوٹتا ہے تو وہ اپنوں کو سفر کے حالات سے ضرور آگاہ کرتا ہے۔ وہ انھیں اپنی خوشیوں، تکلیفوں، حیرتوں، مشاہدوں، تجربوں اور دریافتوں میں شریک کرتا ہے۔ ایک ادیب اس پہلو سے خوش نصیب ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کا اظہار ہزاروں لوگوں کے سامنے کر لیتا ہے۔ افسانہ اور ناول کے بعد سفرنامہ نثری ادب کی سب سے زیادہ پڑھی جانی والی صنف ہے۔ سفرنامہ میں ادیب مختلف مسائل کو موضوع سخن بناتا اور مختلف اسالیب کو اختیار کرتا ہے اور یوں ایک صنف میں مختلف اصناف ادب کو یکجا کر دیتا ہے۔

ریحان احمد کا سفر نامہ کینیڈا، امریکا اور سعودی عرب کے اسفار پر مشتمل ہے۔ ہر مصنف کی تحریر اس کی شخصیت کی بھی عکاس ہوتی ہے۔ اس سفر نامے سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ریحان احمد سراپا دعوت آدمی ہیں۔ وہ لوگوں کو اس بستی کا مکیں بنانے کے لیے بے تاب ہیں جو عالم کے پروردگار نے جنت کے نام سے آباد کرنی ہے اور اس آگ سے بچانے کے لیے بے قرار ہیں جو رب ذوالجلال نے جہنم کے نام سے دہکانی ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب فکر ونظر آدمی ہیں۔ وہ علمی اسلوب میں دلیل سے بات سمجھتے اور دلیل ہی سے بات سمجھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ خوش مزاج آدمی ہیں۔ بڑی تیز حس مزاح رکھتے ہیں۔ لطیف باتوں پر مسکراتے ہیں اور دوسروں کو بھی ''مسکرواتے'' ہیں۔ اس طرح یہ سفر نامہ دعوت وسیاحت، دین ودانش، فکر ونظر اور تفکر و تفنن کا حسین امتزاج بن گیا ہے۔

آیئے ریحان احمد کے ساتھ اس سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ ریحان صاحب ابھی کراچی ائیر پورٹ کے لاونج میں بیٹھے ہوئے ہیں:

''لاونج میں بیٹھ کر میں لوگوں کو جہاز کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس دوران میں اپنی دانست میں ڈالر بچانے کے لیے، کئی دفعہ گھر پر فون کر کے بات کی۔ کیونکہ جو کال ابھی ۵ روپے میں ہو رہی تھی اگلے دن سے ۵ ڈالر میں بھی نہیں ہوا کرے گی۔ جب لوگوں کا رش ختم ہو گیا اور فائنل کال دے دی گئی تو آخری چیکنگ سے گزر کر میں جہاز میں داخل ہو گیا۔ میری اس تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ اگلے ۲۴ گھنٹے جہاز کے پیٹ میں گزارنے تھے۔ جہاز کا سفر اگر مختصر ہو تو کافی خوش گوار ہوتا ہے، لیکن یہ سفر اگر چند گھنٹوں سے بڑھ جائے اور سفر بھی پی آئی اے سے کیا جا رہا ہو تو بہت تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ تاہم میں نے اس مشکل سے بچنے کا ایک راستہ یہ نکالا کہ خود کو تصور میں، ہزاروں میل کا یہ سفر اونٹ پر کرتے ہوئے دیکھا۔ ایسا کرنے کے بعد بے اختیار خدا کی اس عظیم نعمت کا احساس ہوا جو جہاز کی شکل میں میرے سامنے تھی۔ اگر آپ میرے تجربے کی معنویت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ذرا ساحل سمندر پر جا کر صرف آدھے گھنٹے تک دوڑتے اونٹ کی سواری کر لیجیے۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ماضی میں لوگ جب اس چولیں ہلا دینے والے تجربے سے گزرتے ہوں گے تو ان کا کیا حال ہوتا ہو گا۔ جدید سائنسی ترقی کے ذریعے سے خدا نے انسانوں کو کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا ہے مگر انسان شکر گزاری کے بجائے ناشکری کا رویہ اختیار کرتا چلا جاتا ہے''(۱۳)

اس وقت ریحان احمد کینیڈا میں ہیں۔ قومی درد رکھنے والا آدمی بھی کیسا ہوتا ہے، کسی اچھی بات سے خوش ہو تو ساتھ ہی دکھی بھی ہو جاتا ہے:

''یہاں لائن بنانا ایک ضروری عمل ہے جس کی خلاف ورزی ایک سماجی جرم ہے۔ اگر کسی جگہ بوجوہ قطار نہیں بھی ہو تو ڈسپلن کے تحت یہ خیال رکھتے ہیں کہ اصولاً کس کا نمبر ہے۔ مجھے اس سلسلے میں ایسے ایسے تجربات پیش آئے ہیں کہ اگر ہم مسلمانوں کے طرز عمل سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ مجھے کینیڈا میں یہ تجربہ بھی ہوا کہ میں ایک بینک میں قطار میں کھڑا تھا، لیکن اپنی سلپ بھرنے کے لیے میں قطار سے نکل گیا۔ میرے سلپ بھرنے کے دوران میں کئی لوگ لائن میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے اپنے پاکستانی تجربے کے پیش نظر محسوس کیا کہ اگر میں واپس جا اپنی جگہ کھڑا

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

ہونے کی کوشش کرتا ہوں تو بدمزگی کا پورا امکان ہے۔ میں یہ سوچ کر لائن کے آخر کی طرف جانے لگا تو میرے پیچھے والے شخص نے، جو اس وقت تک کاؤنٹر کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا، مجھے آواز دے کر بلایا اور اپنے سے آگے کھڑا کر لیا۔

اب ذرا ایک اور منظر ملاحظہ فرمائیے۔ حرم پاک مسلمانوں کا مقدس ترین مقام ہے۔ اس کی عظمت پر ہر مسلمان نثار ہونے کے لیے تیار ہے، مگر اس کی تمام تر عظمت کے باوجود اس کے بارے میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث موجود ہے کہ ایک مسلمان کی جان، مال، عزت و آبرو اس سے زیادہ محترم ہے۔ اسی حرم میں مسلمان باجماعت صف در صف نماز ادا کرتے ہیں۔ جیسے ہی امام صاحب سلام پھیرتے ہیں، انتہائی منظم انداز میں نماز پڑھنے والے یہ نمازی وحشیوں کی طرح حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں اور اس کے بعد اگلی نماز تک وہ دھینگا مشتی ہوتی ہے کہ الامان الحفیظ۔ اس بلوۂ عام میں گھس کر حجر اسود کو بوسہ دینے کی کوشش کرنا کسی شریف آدمی کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ ایسا کرنا اپنی جان، مال اور آبرو تینوں کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ حالانکہ لوگ اگر قطار بنا لیں تو ہر شخص بلا کسی زحمت سکون سے اسے بوسہ دے سکتا ہے۔'' (۳۷۔۳۸)

کینیڈا ہی میں ریحان احمد کا ایک مشاہدہ اور تجزیہ ملاحظہ کیجیے:

''مجھے کینیڈا آئے ہوئے دو ہفتے ہونے کو تھے۔ عام طور پر مغربی تہذیب کے بارے میں تاثر یہی ہے کہ یہ لوگ جنسی معاملات میں حد سے گزرے ہوئے لوگ ہیں تاہم ابھی تک کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا جس سے اس تاثر کو تقویت ملتی۔ ...... جب میں ریسورس سنٹر سے واپس آ رہا تھا تو پہلی بار ان گنہ گار آنکھوں نے وہ منظر بھی دیکھ لیا جو شاید مقامی لوگوں کے لیے تو کوئی خاص بات نہیں، مگر ایک نئے آنے والے کے لیے غیر متوقع طور پر اسے دیکھ کر نظر انداز کرنا آسان نہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب میں بھی مقامی ہو گیا تو ''نگاہ میں کوئی برا نہ رہا'' ...... مغربی تہذب جس اخلاقی بگاڑ اور مادر پدر جنسی آزادی کے دور سے گزر رہی ہے اس پر ہماری طرف سے کافی اعتراضات کیے جاتے ہیں اور اسے مغربی زندگی کا ایک بڑا منفی پہلو خیال کیا جاتا ہے۔ تاہم اہل مغرب اپنے اس رویے کو معیوب خیال نہیں کرتے۔ وہ اسے آزادی عمل کے غیر متنازع اور مسلمہ انسانی اقدار کا لازمی نتیجہ خیال کرتے ہیں۔

مغربی فکر کے ارتقا سے واقف لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ نشاۃ ثانیہ کے دور میں جو ردعمل مروجہ عیسائی مذہب کے خلاف ہوا وہ بڑھتا ہوا انکارِ مذہب تک جا پہنچا۔ دریافت و ایجاد کے جوش میں فکر و عمل کی جو راہیں کھلیں انھوں نے ہر پہلو سے مذہب کو ایک کونے میں کر دیا۔ اس صورت حال کے متعدد اسباب تھے، جن میں پاپائیت کی بے لوچ حکومت کے خلاف ردعمل، مذہبی عقائد و مسلمات کا جدید سائنسی انکشافات کے خلاف ہونا اور اہل کلیسا کا اپنے توہمات پر اڑ جانا نمایاں تھے۔ مثلاً مسیحی فکر میں زمین کو کائنات کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی کیونکہ یہ ان کے خدا کی جنم بھومی تھی۔ جبکہ سائنس کے نزدیک یہ بات خلاف واقعہ تھی۔ لیکن انھوں نے اس حقیقت کو ماننے کے بجائے سختی سے جدید خیالات کو دبانے کی کوشش شروع کر دی، جس کے نتیجے میں مذہب کے خلاف جذبات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔

انیسویں صدی تک مغربی فکر کے لیے نظریاتی طور پر بھی خدا کو ساتھ لے کر چلانا مشکل ہو گیا۔ مگر رکاوٹ یہ تھی کہ انسان

ایک توجیہ پسند مخلوق ہے۔ انکارِ خدا کے بعد لازمی تھا کہ خدا کے بغیر انسان اور کائنات کی توجیہ کی جائے اور ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کے لیے یہ بتانا ضروری تھا کہ بغیر ایک خالق کے کائنات اور انسان کیسے وجود میں آئے۔ قرآن بھی اپنے منکرین کے سامنے یہی سوال رکھتا ہے: ''کیا یہ بغیر کسی (پیدا کرنے والے) کے پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود پیدا کرنے والے ہیں؟ کیا انھوں نے ہی آسمان وزمین کو پیدا کیا ہے؟ بلکہ یہ یقین نہ کرنے والے لوگ ہیں؟ (الطور ۵۲: ۳۵۔۳۶)

کائنات کا مسئلہ تو خیر آج کے دن تک حل نہیں ہو سکا، بلکہ الٹا Big Bang Theory نے اب اس بات کا پورا امکان سائنسی بنیادوں پر ثابت کر دیا ہے کہ کائنات کا آغاز جس دھماکے سے ہوا، وہ ایک خالق کی بیرونی مداخلت کے نتیجے میں ظہور پزیر ہوا۔ البتہ اس زمانے میں ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی صورت میں خدا کے بغیر انسان کی توجیہ کی ایک شکل لوگوں کے سامنے آ گئی۔ گویا بندر کے ہاتھ ناریل لگ گیا (نظریۂ ارتقا میں بندر اور انسان میں جو خصوصی تعلق ہے، یہ محاورہ پڑھتے ہوئے، وہ ذہن میں حاضر رہے) حال یہ ہوا کہ ڈارون کو The man who killed the God کا خطاب مل گیا۔ نظریۂ ارتقا کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب، اس کی تمام تر علمی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود یہی تھا کہ اس نے سائنسی بنیادوں پر خدا سے ہٹ کر انسان اور حیات کی توجیہ کرنے کی کوشش کی۔

پھر کیا تھا سماجی، عمرانی، نفسیاتی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور تاریخی علوم کے ماہرین کی ایک فوج انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر اس اصول کی روشنی میں کام کرنے کے لیے کھڑی ہو گئی کہ انسان ایک بے خدا اور حیوانی الاصل ہستی ہے۔ ان علوم میں سے دو ایسے تھے جن سے موجودہ جنسی بے راہ روی کی فضا ہموار ہوئی۔ پہلا علم نفسیات کا تھا۔ فرائڈ نے اس پر کام کیا اور جنس کے جذبے کو بنیاد بنا کر تمام انسانی اعمال واعتقادات کی تشریح کر ڈالی اور اسی بنیادی جبلت (Basic Instinct) کو زندگی کی روح رواں قرار دیا۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.com

اس سے کہیں زیادہ اثر اس کام کا ہوا جو انسانی تہذیب پر کیا گیا۔ اس میں دکھایا گیا کہ جنسی اخلاقیات کا ماخذ فطرت یا مذہب نہیں بلکہ معاشی نظام ہے جو شکار سے زراعت اور زراعت سے صنعت تک پہنچا ہے۔ اس علم کے مرتبین نے یہ بتایا کہ انسانی معاشروں میں ابتداءً مرد وعورت کے تعلقات مکمل جنسی آزادی کے اصول پر قائم تھے۔ مگر جب انسان نے شکار سے زراعت کے عہد میں قدم رکھا تو زمین کی انفرادی ملکیت کا نظریہ پیدا ہوا۔ ایک مرد کو زمین پر کام کاج کرنے کے لیے کام کرنے والوں کی ضرورت پڑی۔ ان کارکنوں کے حصول کا بہترین ذریعہ اولاد تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ شادی کا سلسلہ شروع ہو جس میں کسی عورت کی وفاداریاں صرف ایک مرد سے وابستہ ہوں اور اس سے ہونے والی اولاد صرف اسی کی ملکیت ہو۔ عورت کے ایک مرد کی ملکیت ہونے کے اسی تصور سے عصمت اور حیا کے تصورات پیدا ہوئے۔ تاکہ ان پابندیوں سے عورتوں کی لگام ہمیشہ مردوں کے ہاتھ میں رہے۔ جبکہ مردوں نے خود کو ہمیشہ ان زنجیروں سے آزاد رکھا ہے۔

اس تحقیق کے مطابق اب انسان نے زراعتی دور سے صنعتی دور میں قدم رکھ دیا ہے۔ پیداواری عمل میں نہ صرف انسانوں کی اہمیت کم ہو گئی ہے بلکہ عورت خود معاشی طور پر مکمل آزاد ہے۔ لہٰذا اب نہ کسی عورت کے ایک مرد سے جڑے رہنے کی کوئی ضرورت ہے نہ شادی کی، نہ عصمت کوئی قابل لحاظ شے ہے نہ حیا کی کوئی ضرورت ہے۔ نتیجے کے طور پر خاندان کے بنیادی

ادارے کی ساری اساسات ختم ہوگئیں۔

اس پس منظر کو اگر آپ ذہن میں رکھیں تو آپ کی سمجھ میں آئے گا کہ کیوں اہل مغرب بغیر شادیوں کے ساتھ رہتے ہیں، کیونکہ خاندان کا ادارہ کمزور ہو چکا ہے، کیوں وہ شادی کے بعد بھی دیر سے اور کم بچے پیدا کرتے ہیں، کیوں عورتیں رسیاں تڑا کر گھر سے باہر نکل آنا ضروری سمجھتی ہیں اور کیوں جنسی تسکین کے لیے وہ ہر رکاوٹ کو پھلانگنا باعث فخر سمجھتے ہیں۔'' (۵۲،۵۰)

آیئے اب امریکا چلتے ہیں۔ سفر نامہ نگار بتاتے ہیں:

''امریکا کم وبیش ایک براعظم جتنا وسیع ہے۔ یہاں فطرت اپنے ہر رنگ میں جلوہ گر ہے۔ عظیم سمندر، طویل ساحل، لق و دق صحرا، بلند پہاڑ، بہتے دریا، سرسبز وشاداب میدان، گھنے جنگلات، شدید گرمی، سخت سردی، ہر سو پھیلی بہار اور اجاڑ خزاں، غرض قدرت کی ہر صناعی یہاں دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ اس پر انسانوں کی کاریگری نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا ہے۔ جدید سائنس کی مدد سے مغربی تہذیب نے انسانی زندگی کو جن سہولتوں سے بہرہ مند کیا ہے، وقت کی رفتار کو جس طرح تیز کیا ہے، فطرت کی نیرنگیوں کے ساتھ انسانی عقل وہنر کے جو کرشمے دکھائے ہیں، ان کے مشاہدے کے لیے یہ بہترین جگہ ہے۔

یہ سرزمین اپنے معاشی استحکام کی بنا پر غریب ملکوں کے نوجوانوں کا خواب ہے۔ اپنے حسن وصناعی کی بنا پر دنیا بھر سے آنے والے سیاحوں کی منزل ہے۔ اپنی آزاد خیالی کی بنا پر بند معاشروں کے افراد کے لیے مقام عیش ہے۔ یہاں انسان کو نہ صرف اپنی قیمت ملتی ہے بلکہ اس قیمت سے وہ ہر لذت خرید سکتا ہے۔ زندگی کا ہر حسن، دنیا کی ہر آسایش اور دورِ جدید کی ہر سہولت باافراط اور بآسانی یہاں دستیاب ہے۔ ...... مگر یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ میں نے بارہا ان فلک بوس عمارتوں کو ایک جنگل کی طرح محسوس کیا۔ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ انتہائی بلندی پر واقع اپنے شان دار دفاتر کی کھڑکیوں سے جب ٹریلین ڈالرز کا کاروبار کرنے والے سرمایہ دار باہر جھانکتے ہوں گے تو نیچے چلتے ہوئے انسان انھیں حشرات الارض محسوس ہوتے ہوں گے۔ ان میں سے نجانے کتنے ہوں گے جو ڈالروں کی جھنکار کے پیچھے اپنے ملک، اپنی زمین، اپنی ہوا، رشتے ناطے، چاہنے والے اور دوست احباب چھوڑ کر یہاں آئے ہوں گے۔ مگر یہ ڈالر درختوں پر نہیں لگتے۔ انسان کو اپنا آپ بیچنا پڑھتا ہے۔ اپنا ضمیر، ایمان، دین، تہذیب اور بعض اوقات اولاد بھی تیاگنی پڑتی ہے۔

لوگ ایسے معاشرے کا حصہ بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کی بنا سود پر ہے، جس کے ریشے ریشے میں قمار بازی کی روح سرائیت کی ہوئی ہے، جہاں عریانیت ایک قدر ہے، جہاں شراب ایک ضرورت ہے جہاں مفاد پرستی بقا کا راز ہے۔ غرض شجرِ ایمان کی جڑ کاٹ ڈالنے والا ہر تیشہ یہاں زندگی کا لازمہ ہے۔ یہ بات شاید آخرت فراموش لوگوں کے لیے قابل توجہ نہیں۔ مگر وہ جنھیں اپنے رب کا فرمان یاد ہے: ''اس زمین پر جو کچھ ہے اسے ہم نے اس کی زینت بنایا ہے تاکہ آزمائیں کہ ان میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔ اور جو کچھ اس پر ہے، ہم اسے چٹیل میدان بنا دیں گے'' (الکہف ۱۸: ۷۔۸)، ان کی زندگی کا نصب العین یہ دنیا اور اس کی رنگینیاں نہیں بن سکتیں۔

منکرِ خدا و آخرت تہذیب کا گہوارہ یہ سرزمین ایسی آزمایش ہے جس میں پڑنے کے بعد آدمی کا بچ نکلنا آسان نہیں۔ یا

تو وہ ایک مجاہد کی زندگی گزارے وگرنہ شعوری نہ سہی لاشعوری طور پر انسان خود کو شیطان کے آگے سجدہ ریز ہونے پر مجبور پاتا ہے۔ یہاں آنے سے قبل میں نے سنا تھا کہ مغرب میں رہ کر بھی برائی سے بچا جا سکتا ہے۔ مگر یہاں آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ یہاں اکثر لوگوں کے لیے برائی کا معیار ہی بدل جاتا ہے۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

اس کے برخلاف ایک جنت خدا نے بنائی ہے۔ جس کا حسن کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کان نے سنا، اور نہ کسی دل پر اس کا خیال گزرا۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔ مقابلہ کرنے والوں کو مقابلہ کرنا چاہیے۔ اس جنت کی قیمت بس اتنی ہے کہ انسان اس دنیا کو جنت نہ سمجھے۔ اسے اپنی منزل نہ سمجھے، ایک سرائے سمجھے اور خود کو ایک مسافر۔ جو شخص یہ بات سمجھ لے گا وہ خود بخود اللہ کی فردوس تک جا پہنچے گا۔'' (۶۹۔۷۱)

ریحان احمد کی ''بدذوقی''، خوش خُلقی اور خوش طبعی کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے:

''...... جب دوبارہ ٹرین روانہ ہوئی تو یہی لڑکی میرے پاس آئی۔ اس کا نام حنا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ ٹورنٹو میں رہتی ہے۔ کالج کی طالبہ ہے اور ساتھ میں جاب بھی کرتی ہے۔ اس وقت وہ اپنے انکل کے پاس نیویارک چھٹیاں منانے جا رہی ہے۔ وہ اکیلی سفر کر رہی ہے اور اس لیے بہت بور ہو رہی ہے۔ میں بدقسمتی سے اسے کسی قسم کی کمپنی دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اولاً میں تنہائی چاہتا تھا۔ ثانیاً، کمپنی دینے کے لیے مجھے اسے اپنے ساتھ بٹھانا پڑتا۔ گو مغربی معاشرے میں یہ ایک معمول کی بات ہے، بالخصوص بس اور ٹرین میں تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں جہاں مرد و زن ایک ساتھ ہی سفر کرتے ہیں، مگر مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مغرب میں اپنے قیام کے دوران میں جب کبھی کوئی لڑکی ٹرین یا بس میں میرے پاس آ کر بیٹھتی تو میں سیٹ چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ میں صرف اتنا اہتمام کرتا کہ میرا جسم اس کے جسم سے مس نہ ہونے پائے۔

یہ قارئین کی بدقسمتی ہے کہ وہ ایسے بدذوق شخص کا سفرنامہ پڑھ رہے ہیں جو ریل کے ایک بہت رومانٹک سفر میں ایک تنہا نوجوان لڑکی کو ساتھ بٹھانے سے گریزاں ہے۔ جبکہ یہ بھی ممکن ہے کہ تھوڑی دیر میں وہ لڑکی مصنف کے کندھے پر سر ٹکا کر سو جائے۔ ایک سفرنامے میں رنگ بھرنے کے لیے یہ آئیڈیل صورت حال ہے۔ مگر الحمد للہ راقم کوئی بڑا مصنف یا ادیب نہیں ایک عام آدمی ہے جسے روزِ قیامت خدا کے علاوہ واپس جا کر اپنی بیوی کو بھی منہ دکھانا ہے۔ اور جو، سفرنامے میں قارئین کی دلچسپی بڑھانے کے لیے اپنی ازدواجی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔'' (۵۷۔۵۸)

ریحان احمد امریکا میں ایک عمارت کی چھت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ماحول کو حقیقت سے قریب کرنے کے لیے چھت کو گنبد نما آسمان کی شکل میں بنایا گیا تھا۔ اس کا رنگ وقفے وقفے سے بدلتا رہتا۔ جن سے دن اور رات کے مختلف اوقات کا تاثر ابھرتا۔ صبح کا جھٹپٹا، دن کا اجالا، شام کی ملگجی روشنی اور رات کا تاروں بھرا آسمان۔ سب وقفے وقفے سے آتے رہتے۔ اب سب کے ساتھ ابر آلود موسم اور بارش کی بھی عکاسی کی گئی تھی، جس میں گرج چمک اور بارش کے صوتی اور بصری اثرات سے حقیقت کا رنگ بھرا گیا۔ غرض بڑی چابک دستی سے فطرت کی

www.alghamidi.org
www.javedahmadghamidi.com

نقل کی گئی تھی۔ہم کافی دیر تک وہاں بیٹھے اور اس مہارت کی داد دیتے رہے۔(۷۸)

اور پھر امریکا میں مستقل اقامت اختیار کرنے کے بجائے کچھ اور ہی سوچنے لگتے ہیں:

''میں سوچ رہا تھا کہ جب انسان اپنے تمام تر عجز کے باوجود ایسی کاریگری دکھا سکتا ہے تو خدا ــــ کائنات کا پالنہار اور تمام خزانوں کا مالک ــــ جب فردوس کی صورت میں اپنی خلاقی کا مظاہرہ کرے گا تو اس کا عالم کیا ہوگا۔یاقوت و مرجان کی وہ بیٹیاں چاند و سورج جن کی دل کشی کو سجدہ کریں،شیشے اور موتی کے وہ محل جن کا مسالا مشک و عنبر ہوگا،سونے اور چاندی کے وہ درخت جن کے سائے ابدی اور پھل ہر لحہ قابل رسائی ہوں گے،بکھرے موتیوں جیسے وہ خدام جو آخری حد تک مالک کے مزاج آشنا ہوں گے،دودھ،شہد،ماءِ مصفا اور شراب کی وہ نہریں جو پینے والوں کو ہر گھونٹ میں صحت و زندگی اور لطف و لذت کے ایک نئے ذائقے سے آشنا کریں گی اور نجانے کیا کیا کچھ۔مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ بتا دیا ہے کہ جہاں تمھارے علم و ادراک کی حدیں ختم ہوتی ہیں خدا کا فن وہاں سے شروع ہوتا ہے۔اور خود خداوند یہ کہتا ہے کہ یہ وہ سلطنت ہے جہاں ملے گا جو مانگو گے اور دیا جائے گا جو تمھارا دل چاہے گا،جہاں خوف پر مار سکتا ہے نہ غم کا کوئی گزر ہے،جہاں ماضی اپنے تمام تر پچھتاووں کے ساتھ غیر موجود ہے اور مستقبل اپنے تمام تر اندیشوں کے ساتھ غیر حاضر۔یہ خدا کے غلاموں کی ابدی بادشاہی ہے جس سے وہ نکلنا چاہیں گے نہ کوئی انھیں نکالے گا۔کوشش کرنے والوں کو اس جنت کی کوشش کرنی چاہیے۔مقابلہ کرنے والوں کو اس جنت کے لیے مقابلہ کرنا چاہیے۔

انسان کے تحت الشعور میں کہیں اس فردوس کی کوئی جھلک ضرور موجود ہے جو اسے ہر جگہ اس کی نقل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔اللہ نے یہ جھلک انسان میں اس لیے رکھی ہے کہ انسان اللہ سے اس فردوس کو خرید لے۔مگر پیغمبروں کی رہنمائی کھو دینے کے بعد انسان اس دنیا میں ہی فردوس کی تعمیر میں لگ جاتا ہے۔میں اور آپ کتنی سادگی سے زندگی گزار سکتے ہیں،مگر نہیں گزارتے۔زندگی کو زیادہ سے زیادہ پر آسایش بنانے کی کوشش کرتے چلے جاتے ہیں۔اپنی ساری توانائی دنیا میں اپنی جنت کی تعمیر کی کوشش میں گنوا دیتے ہیں۔مگر جنت نہیں بن پاتی۔بار بار ہماری محدودیت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ہم کھانا کھاتے ہیں مگر پیٹ بھر جاتا ہے،ہم نکاح کرتے ہیں مگر یکسانی سے اکتا جاتے ہیں ہم تھک جاتے ہیں،اداس ہو جاتے ہیں بوڑھے ہو جاتے ہیں،بے زار ہو جاتے ہیں،بیمار ہو جاتے ہیں اور ہم ......اپنی فردوسِ ناتمام کو چھوڑ کر اپنے رب کے حضور میں لوٹ جاتے ہیں جہاں ہماری اصل جنت موجود ہے مگر اس وقت اسے خریدنے کے لیے ہمارے پاس سرمایہ نہیں ہوگا۔وہ تو ساری دنیا کی جنت کی تعمیر کے لیے خرچ ہو چکا۔ہاں کچھ ہوگا تو ابد تک اپنی محرومی پر رونا اور چلانا ہوگا۔وہ میری ٹریجڈی تھی یہ میرے ابنائے نوع کی ٹریجڈی ہے۔پتا نہیں کس کی ٹریجڈی زیادہ بڑی ہے۔کون جانے............''(۷۹۔۸۰)

لیجیے،اب ریحان احمد ایک ایسے مقام کی طرف عازم سفر ہوئے ہیں جہاں انھوں نے ''دیکھنا'' اور ''گھومنا'' نہیں،بلکہ ''حاضر ہونا'' ہے۔

لبیك اللھم لبیك لبیك لا شریك لك لبیك

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ان الحمد و النعمة لك و الملك لا شريك لك ۔

حاضر ہوں ! اے اللہ میں حاضر ہوں ! حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں ! بے شک ، ہر نعمت اور تعریف تیری ہے اور بادشاہی بھی ! تیرا کوئی شریک نہیں !

اس غیر معمولی موقع پر ریحان احمد ''خوابوں کی سرزمین'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''میں مغربی تہذیب کے مرکز میں چار مہینے رہا۔ میرا یہ سفر ایک طالب علم کا سفر تھا۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو پہلے ایک نقطۂ نظر قائم کر لیتے ہیں اور پھر جو چیز اس کے خلاف سامنے آئے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ میں نے مغرب میں جو خوبیاں دیکھیں کھلے دل سے ان کا اعتراف کیا اور جو خامیاں نظر آئیں انھیں بیان کرنے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ تاہم یہاں سے روانگی کے وقت میرے دل کی وہی کیفیت تھی جس میں ڈوب کر اقبال نے اپنا یہ شعر کہا تھا۔ میں اس میں ذرا سی لفظی ترمیم حسب حال کر رہا ہوں۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ ''رونق'' فرنگ

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و ''حرم''

حرمین سے میرا تعلق وہ بھی ہے جو ہر مسلمان کا ہوتا ہے اور وہ بھی جو بالکل ذاتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے بہترین دن اسی صحرا کی چھاؤں میں گزارے ہیں۔ جب وقت کی تپتی دھوپ نے میرے وجود کو جھلسا دیا تو خدا نے اسی مبارک زمین کو میرے لیے سائبان بنایا تھا۔ یہ دھرتی میرے جسم کے لیے ہی نخلستان نہ تھی بلکہ میری روح کے لیے بھی ایک چھایاں بن گئی۔ آج میں اسی سائبان کی طرف واپس لوٹ رہا ہوں۔ یہ میری خوابوں کی سرزمین ہے جن کی تعبیر ایک دفعہ پھر مجھے بلا رہی ہے۔'' (۱۹۹)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

آگے چلیں۔ بیت اللہ قریب ہے:

''خدا کے گھر میں داخلے کے احساس نے وجود کی گہرائیوں میں اطمینان وسکون کی لہر دوڑا دی۔...... میں اپنی اہلیہ کے ساتھ مطاف کی طرف بڑھ گیا۔...... میں حسب عادت مطاف کی سیڑھیوں سے قبل رکا اور نگاہیں اٹھا کر بیت اللہ کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ دنیا میں حسن کی بہت سی قسمیں ہیں۔ لیکن حسن وسادگی اور جمال وجلال کا جو امتزاج اس چار دیواری میں ہے، کہیں اور نہیں...... دوران طواف میں لوگ بہت کچھ کرتے ہیں، مگر میں صرف دو کام کرتا ہوں: دعا یا تسبیح۔ اس جگہ انسان کو یا تو وسیع تر کائنات کا حصہ بن جانا چاہیے جو ہر آن خدا کی تسبیح کرتی ہے یا پھر ایک سخی داتا ان داتا کے حضور میں پیش ایک محروم بھکاری۔...... طواف سے فارغ ہو کر میں نے اہلیہ کو ان کے گھر والوں کے پاس بھیج دیا کیونکہ انھیں عمرہ نہیں کرنا تھا اور خود ملتزم سے آ کر لپٹ گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے حضور میں راز و نیاز کیا کرتے تھے۔ میں یہاں پہنچا تو یوں لگا کہ جیسے میں خدا سے ملاقات کے لیے آیا ہوں۔ وہاں بہت لوگ کھڑے تھے، مگر سب ایک دوسرے کے لیے غیر موجود۔ سب ایک دوسرے سے لاتعلق۔ وہاں انسان تھا یا خدا۔ تیسرا کوئی نہیں تھا۔ میں بھی خلوت میں چلا گیا۔ اس

دوران میں پتا نہیں کیا کچھ ہوا۔ میرے لیے تو کچھ نہ رہا تھا۔ جو رہی تو بے خبری رہی۔ جب وہاں سے ہٹا تو محسوس ہوا کہ بہت سارا گند بہت ساری بارش کے ساتھ بہ گیا ہے۔'' (۲۰۵۔۲۰۶۔۲۰۷)

اور اب ریحان احمد مدینہ کے حدود میں داخل ہو رہے ہیں۔ ایک غیر معمولی سعادت حاصل کر رہے ہیں:

''(مدینہ) وہ سرزمین جسے خدا نے روزِ ازل سے اسلام کی نصرت و سربلندی کے لیے چن لیا۔ وہ سرزمین جس نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس وقت اپنے دروازے کھولے جب دوسرا ہر دروازہ بند ہو گیا تھا۔ وہ سرزمین جہاں نہ صرف اسلامی بلکہ انسانی تاریخ کا فیصلہ کن باب رقم ہوا۔ وہ سرزمین جس سے طلوع ہونے والے خورشید ہدایت نے کل عالم سے باطل کی ظلمتوں کو دور کر دیا۔ وہ سرزمین جہاں ایثار و قربانی، وفا و محبت، سمع و طاعت اور شجاعت و استقامت کی لافانی داستانوں نے جنم لیا۔ وہ سرزمین جو آج بھی اہل شوق و محبت کے دل کا سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ وہ سرزمین خدا نے آج اپنے لطف و کرم سے ایک دفعہ پھر دکھلا دی۔ فالحمد للہ رب العالمین۔

مدینے کی حدود میں داخل ہوتے ہی دور سے مسجد نبوی الشریف علی صاحبہا صلوٰۃ وسلام کے بلند و بالا مینار نگاہوں کی تراوٹ اور قلب کو سکون دینا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ شہر، مکہ کی طرح، مجھے کبھی اجنبی نہیں لگا۔ بلکہ مدینہ تو ہمیشہ ماں کی آغوش کی طرح فراخ اور پرسکون لگا ہے۔ یہاں خدا کبھی خدائے ذوالجلال نہیں لگا، ہمیشہ خدائے کریم محسوس ہوا ہے۔ یہاں اس کی رحمت اس کے غضب پر حاوی نظر آتی ہے۔ اس شہر پر ستر ماؤں سے بڑھ کر چاہنے والے رب کی ٹھنڈی چھاؤں ہمہ وقت سایہ فگن رہتی ہے۔'' (۲۲۶۔۲۲۷)

یہ اس سفر نامہ کے چند نمونے ہیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سفر نامہ کس قدر دلچسپ اور پر تاثیر ہے، مگر بعض مقامات پر یہ سفر نامہ مقالہ محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ اس مسئلے کا احساس مصنف کو بھی ہے اور وہ ایسے مقامات پر لکھتے ہیں:

''آٹھ صفحوں کی یہ بحث ہزاروں صفحات کے میرے مطالعے کا نچوڑ ہے اور مستقبل میں ہونے والے اسلام اور مغرب کے ٹکراؤ کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے میں کافی مفید ثابت ہوگی۔ تاہم جو قارئین صرف سفر نامے میں دلچسپی رکھتے ہوں وہ ان صفحات کو چھوڑ کر اگلا باب شروع کر سکتے ہیں۔'' (۱۱۹)

''معاف کیجیے گا میں آپ کو سفر نامے سے بہت دور لے گیا۔ دراصل مغرب الحاد (Atheism) اور عیسائیت دونوں کا گڑھ ہے۔ میرے جیسے آدمی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں ان سے لاتعلق ہو کر گزر جاؤں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسباب بھی ایسے پیدا کیے کہ مجبوراً مجھے دونوں پر قلم اٹھانا پڑا۔ مجھے امید ہے کہ پڑھنے والوں کے دل میں اگر ایمان کا کوئی شائبہ بھی موجود ہے تو انھیں یہ بحث غیر متعلق نہیں لگی ہوگی۔'' (۱۰۵)

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب ایک سفر نامہ کے نام سے لکھی گئی ہے، قاری اسے سفر نامہ ہی کے موڈ سے پڑھتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ قاری کے اس موڈ کو پیش نظر رکھا جائے۔ اور پھر یہ انحراف فنی لحاظ سے بھی سفر نامہ کو مجروح کرتا ہے۔ ایک ناول نگار اگر اپنے ناول کے کسی مقام پر یہ محسوس کرے کہ اس کا ایک کردار روسی کیمونسٹ ہے تو کیوں نا اس موقع پر اس کردار کے

حوالے سے اسلامی نقطۂ نگاہ سے روسی تہذیب اور کیمونزم پر تنقیدی مضمون لکھ دیا جائے اور ساتھ یہ وضاحت کر دی جائے کہ جو قارئین صرف ناول میں دلچسپی رکھتے ہوں، وہ ان صفحات کو چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں اور یہ کہ پڑھنے والے کے دل میں اگر ایمان کا شائبہ بھی موجود ہے تو انھیں یہ بحث غیر متعلق نہیں لگی ہوگی تو ہمارا خیال ہے کہ قارئین اور ناول کے ساتھ کچھ زیادتی ہو جائے گی۔ فن بہر حال فن ہے اس کے تقاضوں کی پوری طرح تکمیل کرنی چاہیے اس مسئلے کو جذباتی طور پر دین و ایمان کا مسئلہ بنا کر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے ورنہ ناقدین فن کے ہاں ایسی کاوشیں بار نہیں پاتیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قارئین کا حلقہ بھی محدود ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ ادیب کے نظریات کا اظہار اس کی ادبی تحریر میں بھی ہو جاتا ہے اور یہ اظہار بالکل فطری ہوتا ہے، مگر یہ اظہار بہت مختصر، ضمنی، اور اشاراتی اسلوب میں ہونا چاہیے۔ مصنف نے یہاں باقاعدہ عنوانات اور صغریٰ کبریٰ قائم کر کے علمی بحثیں کی ہیں۔ اگرچہ یہ بحثیں بہت اچھی ہیں، مگر ایک اچھی بات بے موقع ہو جائے تو اچھی نہیں لگتی۔ اسی طرح بعض مقامات پر بہت ذاتی قسم کے معاملات بیان کر دیے گئے ہیں۔ یہ چیز بھی عام قارئین کی کتاب کے ساتھ دلچسپی کو متاثر کرتی ہے۔

بہر حال لفظ بہ لفظ پڑھنے کے قابل کتابیں بہت کم ہوتی ہیں، اس سفر نامہ کو بجا طور پر ایسی کتابوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ مصنف کی پہلی کتاب ہے، اس لحاظ سے ان کی کارکردگی بہت اچھی ہے۔ کینیڈا، امریکا اور سعودی عرب جانے والے اس سفر نامہ سے معلومات کے پہلو سے بھی بڑا استفادہ کر سکتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سانحۂ ارتحال

ہمارے حلقہ کے رفیق جناب عمر قریشی صاحب وفات پا گئے ہیں۔ وہ کافی عرصے سے دل کے عارضے میں مبتلا تھے۔ ۱۲ مارچ ۲۰۰۲ کو یہی عارضہ ان کی رحلت کا باعث بنا۔ وہ ۱۹۹۷ میں ''دانش سرا'' کراچی کے حلقے سے وابستہ ہوئے۔ اس وقت سے لے کر وفات تک انھوں نے اپنی وابستگی کو ہر لحاظ سے نبھایا ہے۔ اس دوران میں اپنے طرز عمل سے انھوں نے بعض ایسی مثالیں بھی پیش کی ہیں، جنھیں دہرانا کار دشوار ہے۔ وہ نہایت نفیس، خوش اخلاق اور وضع دار آدمی تھے۔ دین کی حمیت اور نصرت کے جذبے سے سرشار تھے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل کی توفیق اور ان کی عدم موجودگی میں مشکلات کو سہنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ ان کے حسنات کو قبول فرمائے اور سیئات سے درگزر فرمائے اور اس روز جب آخری عدالت لگے گی، انھیں جنت کے انعام کے مستحق ٹھہرائے۔

ـــــ ادارہ

بیاض

—— جاوید

○

علم آشفتہ، عقل بے انداز
اب کہاں دردِ آگہی کا گداز

زندگی کیا ہے؟ حسرتوں کا مزار
یا پھر اندیشہ ہائے دور و دراز

بزمِ ہستی سے بے صدا آتے
اٹھ گیا بے خودی میں پردۂ ساز

ڈھونڈ لیتی ہے آرزو کی کرن
وسعتِ آسماں، پرِ پرواز

پھر وہی جسم و جاں میں ہجر و وصال
پھر وہی انتہا، وہی آغاز

فصلِ گل چھیڑتی ہے تارِ رباب
شوق ہوتا ہے زمزمہ پرداز

وقت خاموش بھی ہے گویا بھی
کھول دیتا ہے آپ اپنا راز

آ رہی ہے صدائے کن فیکوں
مرحبا، حبّذا وہی آواز

جلوۂ نازنیں ہے حسنِ ازل
یہ مرا سجدۂ جبینِ نیاز

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org